Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1974

بتقریبِ یومِ پاکستان

قائدِ اعظم کا ارشاد

(حیدر آباد - دکن میں)

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور ۹

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ - پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
پاکستان ـــــ سالانہ ۱۵ روپے غیر ممالک ـــــ سالانہ ڈیڑھ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/ بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ

جلد (۲۷) ★ مارچ ۱۹۷۳ء ★ نمبر (۳)

فہرست

(۱) لمعات ـــــ ۲

(۲) ۱۹۴۰ء کا ریزولیوشن کن حالات میں پاس ہوا تھا ـــــ ۱۲

(۳) ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء (قائداعظم محمد علی جناح اور شری ابوالکلام آزاد) ۱۷

(۴) قرآن مجید میں تحریف ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۴۱

(۵) جہادِ کشمیر کی حرمت کا فتویٰ ـــــ (شاہد عادل) ـــــ ۵۰

(۶) برخوردارانِ قوم ـــــ ۶۲

ایڈیٹر: محمد خلیل ۔ ناشر: سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/ بی ۔ گلبرگ لاہور ۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف ۔ مطبوعہ: اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اے دوست سُنائے جا بھُولے ہوئے افسانے

جس ماہ (مارچ) کے شروع میں یہ پرچہ قارئین کے سامنے جائے گا، اس کی ۲۳ر تاریخ کو ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا تھا جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا دھارا موڑ دیا تھا۔ قرآن کریم نے کسی پروگرام کی تکمیل کے لئے دو مراحل کا ذکر کیا ہے۔ رسول اللہؐ سے ارشاد ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۔ تم معاملہ زیر نظر کے متعلق اپنے رفقاء سے مشورہ کرو۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۳/۱۵۸) جب اس طرح باہمی مشاورت کے بعد تو کسی فیصلہ پر پہنچ جائے، تو پھر قانونِ خداوندی کی حکمیت پر بھروسہ کرتے ہوئے اس فیصلہ کے بروئے کار لانے کے لئے عملی قدم اٹھاؤ۔ مسلمانانِ ہند کی سیاست کا پہلا دور ایسا تھا جس میں ان کے سامنے نہ کوئی متعین نصب العین تھا، نہ اس نصب العین کے حصول کے لئے باہمی مشاورت سے کوئی پروگرام طے کیا گیا تھا۔ قوم ہمہ تن حرکت ضرور تھی لیکن یہ حرکت، بگولے کا رقص یا سیلاب کی تلاطم خیزیوں سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قدم اٹھتے تھے لیکن منزل قریب نہیں آتی تھی۔ توانائیاں ضائع ہوتی تھیں لیکن ان سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہوتا تھا۔ اس ملی بحران کو دور کرنے کے لئے، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں، قوم کے سامنے ایک متعین نصب العین رکھا۔ اور وہ نصب العین تھا مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا قیام۔ اس وقت قوم کو اس قدر ہنگامہ آرائیوں کا خوگر بنا دیا گیا تھا کہ .... اس نصب العین کو جس کا تعین طویل عرصہ کے قرآنی فکر کا نتیجہ تھا کسی نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس دوران میں، علامہ اقبالؒ کی دیدہ وری نے ایک ایسی شخصیت کو بھانپ لیا جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ وہ اس تصور کو عملی پیکر عطا کرنے کی اہل ہے۔ وہ شخصیت تھی، محمد علی جناحؒ کی جسے بعد میں قوم نے بیک زبان قائد اعظمؒ کہہ کر پکارا۔ قائد اعظمؒ نے اس نظریہ کو سمجھا، اس پر کافی غور و خوض کیا۔ اپنے رفقائے کار سے اس پر مشورہ کیا اور اس کے بعد جب وہ ایک فیصلہ پر پہنچ گئے تو ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس منعقدہ لاہور میں اس فیصلہ کا اعلان کر دیا۔ اس فیصلہ کی بنیاد، دو قومی نظریہ پر تھی جس کی وضاحت، قائد اعظمؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں ان الفاظ میں کی۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی

حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے۔ ہندو اور مسلمان 'مذہب کے معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظام مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا۔ اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس کے بعد انہوں نے بدلائل واضح کیا کہ مسلمان کس طرح بربنائے ایمان، ایک مستقل بالذات' الگ، ممتاز قوم ہیں اور جب یہ ایک الگ قوم ہیں تو ان کی الگ' جداگانہ، آزاد مملکت کا قیام اس کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے۔ اور ان دلائل و براہین کی بنیادوں پر مبنی وہ ریزولیوشن پاس کیا گیا جس میں مسلمان اکثریت کے علاقوں میں ان کی جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ ریزولیوشن' قرارداد پاکستان کے نام سے متعارف ہے۔ اس فیصلہ (عزم) کے بعد' اس کے بروئے کار لانے کے لئے جدوجہد شروع کی گئی۔ جو ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی ایک عظیم، آزاد مملکت کے وجود پر منتج ہوئی۔ یوں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نئے موڑ مڑنے کا موجب بنی۔ ہندوؤں کی طرف سے اس فیصلہ کی مخالفت کس کس انداز سے ہوئی' اس کے متعلق طلوع اسلام پہلے دن سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آرہا ہے۔ اشاعت حاضرہ میں' چند صفحات آگے جا کر' آپ کے سامنے (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کا وہ خطبہ صدارت آئے گا جو انہوں نے عین انہی دنوں' آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ رام گڑھ میں' بحیثیت صدر کانگریس (ارشاد) دیا تھا۔ یہ ہندوؤں کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کے سلسلۂ دراز کی اہم کڑی تھی۔

مسلمانوں کے لئے ایک الگ' آزاد' مملکت کی ضرورت کیوں تھی اس کی وضاحت علامہ اقبال نے اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت ان الفاظ میں کر دی تھی کہ:-

ہندوستان' دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام' خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظام حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ . . . اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ (اگر اس طرح کی ایک اسلامی مملکت قائم ہو گئی' تو اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکیگا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے

قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔

اسی حقیقت کا اعادہ، قائد اعظم اپنی ہر تقریر اور ہر خطاب میں کرتے رہے؛ وہ برملا کہتے رہے کہ پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزو ایمان بن چکا ہے۔ اب یہ ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور مقدر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آ گیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اٹھے گی کہ ہاں! اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آ گیا ہے جو اسلام کے ماضی کی درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔

(تقاریر قائد اعظم۔ جلد دوم۔ ص ۵۰۹)

اتنا ہی نہیں، وہ یہاں تک کہتے تھے کہ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے، بلکہ یہی اور صرف یہی، واحد نصب العین ہے۔ (تقاریر جناح۔ جلد اول۔ ص ۲۶۷)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ہندوؤں کی طرف سے اس مطالبہ کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ اس مخالفت میں وہ خود تو پیچھے رہتے تھے اور قومیت پرست مسلمان لیڈروں (مثل مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہم) کو آگے بڑھاتے تھے لیکن ان کے علاوہ، اس مخالفت میں ایک اور صاحب بھی اپنے مخصوص حربوں سے کام لیتے تھے۔ یہ تھے جماعت اسلامی کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ جیسا کہ ظاہر ہے اس مطالبہ کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ مسلمان، اسلام کے احیاء کے لئے اپنی الگ مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال اور (ان کے بعد) قائد اعظم بار بار اس حقیقت کو دہراتے تھے۔ لیکن مودودی صاحب یہ کہہ کر مسلمانوں کو ورغلاتے تھے کہ:

مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ (سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم)

مودودی صاحب نے یہ اعلان، سیاسی کشمکش حصہ سوم میں کیا جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ ہم متعدد بار اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ علامہ اقبال اور قائد اعظمؒ ۱۹۴۱ء سے بہت پہلے سے اس امر کی وضاحت کرتے چلے آ رہے تھے کہ مطالبہ پاکستان سے مقصود اسلامی مملکت کا قیام ہے۔ اس لئے مودودی صاحب کا ۱۹۴۱ء میں یہ کہنا کہ لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کا آخری مطمع نگاہ اسلامی مملکت قائم کرنا ہے، مغالطہ آفرینی اور وساوس انگیزی کی نہایت مذموم کوشش تھی۔ ان کے متبعین میں سے بعض حضرات یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ مودودی صاحب کو اس کا علم نہ ہو، اس لئے ان کے اس بیان کو لاعلمی پر مبنی کیا جا سکتا ہے، دانستہ غلط بیانی پر نہیں لیکن

اس کا کیا علاج کہ خود مودودی صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہیں اس کا علم تھا۔ انہوں نے (قیامِ پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ) ۱۹۵۱ء میں اقبال ڈے (لاہور) میں شرکت کی (کیونکہ اُس وقت عام انتخابات سر پر آ رہے تھے اور اقبال ڈے میں شرکت اس سلسلہ میں مفید ہو سکتی تھی)۔ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے۔ انہوں نے فرمایا:۔

> واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک چودہ سال کے عرصہ میں اسلامی جذبہ اسلامی شعور، اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت کے احساس کو مسلمانوں میں قائم رکھنے کے لئے اگر کوئی قیادت کام کر رہی تھی تو وہ اکیلے اقبالؒ کی ذات تھی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا:۔

> اس نے (اقبالؒ نے) مسلمانوں کو یہ شعور دیا کہ قومیت، وطن پر نہیں، دین اور عقیدے پر بنتی ہے۔ تمہاری قومیت ان لوگوں سے مختلف ہے جو تمہارے ساتھ عقیدے کا اختلاف رکھتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ:۔

> اقبال نے ایک علیحدہ مملکت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔

اور پھر یہ کہ:

> اقبالؒ نے آپ کو نظریہ دیا اور قائداعظمؒ نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔
>
> (بحوالہ ایشیا۔ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء)

یعنی اقبالؒ نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک مسلمانوں کو یہ شعور دیا۔ (۱۹۳۸ء میں ان کی وفات ہو گئی تھی) اور اس کے بعد (قائداعظمؒ نے) اقبالؒ کے دیئے ہوئے نظریہ کے مطابق حصول مملکت کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اور ان تمام واضح حقائق اور واقعات کا علم رکھتے ہوئے، مودودی صاحب ۱۹۴۱ء میں فرماتے تھے کہ لیگ کے لیڈروں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کا مطمح نگاہ اسلامی حکومت کا قیام ہے۔ اور اتنا ہی نہیں کہ ۱۹۴۱ء میں یہ کہا۔ ۱۹۴۷ء (یعنی تقسیم ہند) تک برابر یہی راگ الاپتے رہے۔ واضح رہے کہ علامہ اقبالؒ نہ صرف نظریۂ پاکستان کے بانی تھے بلکہ وہ پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب (بقول مودودی صاحب) علامہ اقبال نے انہیں حیدرآباد (دکن) سے بلایا تھا۔ علامہ اقبال کی وفات ۱۹۳۸ء میں ہوئی اور مودودی صاحب نے اپنے سلسلہ مضامین کا آغاز ۱۹۳۹ء سے کیا، جن میں کہا گیا کہ "لیگ کے ذمہ دار لیڈروں" میں سے کسی نے بھی اس امر کی وضاحت نہیں کی تھی کہ ان کا مطمح نگاہ اسلامی مملکت کا قیام ہے۔ (اسی سلسلہ مضامین کو بعد میں سیاسی کشمکش کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا) اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں تک بھی کہہ دیا گیا کہ:۔

ان کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی حیثیت نہیں دیکھی جا سکتی۔

بہرحال، یہ تھا مطالبہ پاکستان کا پس منظر، اور یہ تھا اس کی مخالفت کا انداز۔ کہیں قومیت پرستوں کی طرح "ہاتھ میں کھلا خنجر" لئے اور کہیں اقامتِ دین کے علمبرداروں کی طرح "آستین میں دشنۂ پنہاں" کے ساتھ۔ ان تمام مخالفتوں کے باوجود پاکستان وجود میں آ گیا۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

علامہ اقبالؒ تو تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔ قائداعظمؒ اس کے بعد قریب ایک سال تک زندہ رہے، لیکن ایسے پریشان کن حالات میں جدیوں کہئے کہ ان کے لئے، جان لیوا ثابت ہوئے۔ وہ ہمیں ایک خطۂ زمین دے گئے اور ان مقاصد کی واضح تفصیل جن کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔ ان تفاصیل کا ملخص اُن کے اُن چند جملوں میں سمٹ کر آ گیا ہے جنہیں ہم وقتاً فوقتاً زیبِ دہِ اوراق طلوعِ اسلام کرتے رہتے ہیں اور جو اشاعتِ حاضرہ کے سرورق (ٹائیٹل) پر بھی منقوش ہیں۔ یعنی:۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن حکیم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔

یعنی پاکستان ایک ایسی مملکت کا نام تھا جسے دو قوموں کے قرآنی نظریہ کی بنیادوں پر اس لئے متشکل کیا گیا تھا کہ اس میں قرآنی اصول و قوانین عملاً نافذ کئے جا سکیں۔

لیکن قائداعظمؒ کی وفات کے بعد، ہم نے ان تینوں مقاصد کو حوالۂ گردباد کر دیا۔ ہم نے سب سے پہلے، دو قومی نظریہ کی جگہ یہاں اُسی متحدہ قومیت کو عملاً رائج کیا جسے ہم نے تحریکِ پاکستان کے دوران اسلام کی نقیض اور کافرانہ نظریہ قرار دیا تھا۔ دو قومی نظریہ سے مراد یہ تھی کہ کسی خطۂ زمین میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم محض اشتراکِ وطن کی بنا پر، ایک قوم قرار نہیں پا سکتے۔ سب مسلمان، بلاامتیاز نسل، رنگ، خون، محض مسلمان ہونے کی جہت سے ایک قوم ہوں گے اور غیر مسلم، ان سے الگ، دوسری قوم کے افراد۔ ہم نے پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو ملا کر، ایک قوم قرار دیا، اور اسے آئینی حیثیت بھی عطا کر دی۔ چنانچہ یہاں جو آئین بھی مرتب ہوا، اور آج بھی جو آئین یہاں نافذ ہے، ان میں، مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں کے اختلاط سے قوم متشکل کی گئی ہے۔ یہ بعینہٖ وہی صورت ہے جس پر غیر منقسم ہندوستان میں، ہندو مُصر تھے۔ اور جو آج بھی وہاں نافذ العمل ہے۔ جب آپ نے قومیت

کا معیار، دین کا اشتراک قرار نہ دیا تو پھر اشتراکِ وطن ہی پر کیا موقوف ہے، اشتراکِ نسل یا اشتراکِ زبان سے بھی جداگانہ قومیتیں وجود میں آسکتی ہیں۔ چنانچہ انہی بنیادوں پر پہلے "مشرقی پاکستان میں، مغربی پاکستان سے الگ قومیت کا احساس ابھارا گیا" اور اس کے بعد "مغربی پاکستان میں" صوبائی امتیاز کی بنا پر، چار جداگانہ قومیتوں کا تصور سامنے لایا گیا۔ اس تصور کو صوبوں کے مختلف کلچر کی نشوونما کے نگاہ فریب لباس میں، برابر ہوا دی جارہی ہے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ یہاں کے ذمہ دار اربابِ حل وعقد، چار قومیتوں کی مخالفت یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ یہ نظریہ، دو قومی نظریہ کے خلاف ہے جس پر مملکتِ پاکستان کی عمارت استوار ہے۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ سرکار! پاکستان میں وہ دو قومیں کونسی ہیں جن کا وجود دو قومی نظریہ کا ثبوت ہے۔ یہاں تو آپ نے ایک ہی قوم تسلیم کر رکھی ہے جو مسلم و غیرمسلم ہر دو کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔ سو جس طرح چار قومیتوں کا تصور، اسلام اور بناءِ پاکستان کے خلاف ہے اسی طرح ایک (متحدہ یا مخلوط) قوم کا نظریہ بھی اسلام اور بناءِ پاکستان کے خلاف ہے۔ کیا یہ صورتِ احوال مضحکہ خیز اور عبرت انگیز نہیں کہ آپ کے مخالفین کا نظریہ تو خلافِ اسلام قرار پائے اور آپ کا خلافِ اسلام نظریہ عین مطابق اسلام تسلیم کیا جائے! حقیقت یہ ہے کہ چار قومیتوں کا نعرہ بلند کرنے والے زیادہ دیانتدار ہیں کہ وہ چار قومیتوں کو تسلیم کرتے ہیں تو ان کا علانیہ اعتراف بھی کرتے ہیں، لیکن آپ یہاں ایک (متحدہ) قومیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اعلان دو قومی نظریہ کا کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑا فریب ہے جو قوم کو دیا جارہا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کی شوریدہ بخت ساعت پر اندرا گاندھی نے یہ کہا تھا کہ "مشرقی پاکستان کی علیحدگی، دو قومی نظریہ کے ابطال کا ثبوت ہے۔" اس کی نگاہ اس طرف نہیں اٹھی کہ، دو قومی نظریہ کے ابطال کا ثبوت، مشرقی پاکستان کی علیحدگی نہیں۔ اس کا بیّن ثبوت، پاکستان میں عملاً رائج نظریۂ قومیت ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اس باطل نظریہ کا فطری نتیجہ تھا۔

بہرحال، دو قومی نظریہ جس پر مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کی عمارت استوار ہوئی تھی اور جو اسلام کا بنیادی تقاضا ہے، اسے ہم نے یوں ختم کر دیا۔

جہاں تک قرآنی قوانین کا ہماری آزادی اور پابندی کی حدود ہونے کا تعلق ہے، اس کے متعلق "صورت جیبِ عالم میرس" سے زیادہ تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ جس طرح ہم اپنا نام عبداللہ رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم "اللہ کے عبد" ہو گئے ہیں، حالانکہ ہم ہوتے ہیں عبدالطاغوت۔ اسی طرح ہم نے اپنے ہر آئین میں خدا کی حاکمیت کے الفاظ لکھ کر دنیا کو (یا صحیح تر الفاظ میں) اپنے آپ کو دھوکا دے رکھا ہے کہ مملکت کے اسلامی ہونے کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ یہ وہ خدع (فریب) ہے، جس کا تذکرہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو زبان سے کہتے رہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں، حالانکہ وہ دل سے ان صداقتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔
(۹/۲) یہ لوگ بزعمِ خویش، خدا کو اور سچے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ کسی اور کو نہیں، خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ وہ اس خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ایک الم انگیز تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ وہ الم انگیز تباہی ہے جس میں اس وقت ہماری قوم مبتلا ہے۔ اس وقت قوم کی حالت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو کرب و اذیت میں مبتلا محسوس کر رہا ہے لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کرب و الم کا حقیقی سبب کیا ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ حقیقی سبب وہی ہے جسے قرآن نے ان دو لفظوں میں واشگاف کر دیا ہے کہ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔ "وہ زبان سے تو اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں" اس لئے اپنے زبانی اقرار کو خود ہی جھٹلا دیتے ہیں۔ ہم ایک انجانے الم میں مبتلا ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے تحت الشعور میں آنے والی تباہی کا لاوا کھول رہا ہے جس دن یہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا، تہ کہ ما منزلت باشد نہ مہ را۔ ہم اس آنے والی تباہی کو بڑی تیزی سے اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بہ بیم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم!

ہم نے مملکتِ پاکستان کی دینی اساس کو تو یوں ختم کر دیا۔ اب رہی خود مملکت، سو وہ ایک ہی جھٹکے میں آدھی رہ گئی۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی ہماری کیفیت بڑی مضحکہ خیز ہے۔ تاریخ میں بڑے بڑے غدار نظر آتے ہیں، لیکن قوموں نے ان غداروں کو ہمیشہ غدار کہا۔ مملکتِ پاکستان ایک وحدت تھی اور مشرقی پاکستان اس کا ایک حصہ یا صوبہ۔ وہاں ایک غدار اٹھے، ہندو جیسی مسلمان اور اسلام کی ازلی دشمن قوم سے مل کر سازش کی اور اس حصہ ملک میں اپنی آزاد مملکت قائم کر لی۔ ان حالات میں، مجیب کے غدار ہونے میں کوئی دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ لیکن وائے برحال ما کہ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں اور اچھے اچھے ذمہ دار لوگ۔ جو یہ کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان، مملکتِ پاکستان کا ایک حصہ تھا ہی نہیں۔ وہ ایک الگ آزاد مملکت تھی۔ پاکستان متشکل کرنے والوں کی یہ دھاندلی تھی کہ اس کی حیثیت مملکتِ پاکستان کے ایک حصہ کی سی قرار دے دی۔ یہ اس حصہ کے ساتھ سراسر زیادتی تھی۔ اتنا عرصہ تک وہ اس زیادتی کو برداشت کرتے رہے۔ اب جب انہوں نے حالات کو سازگار پایا تو اپنا جائز حق لینے کے لئے جدوجہد کی اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے لئے یہ حضرات دلیل یہ لاتے ہیں کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں دو مملکتوں کا ذکر تھا۔ ہم اس سلسلہ میں متعدد بار تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ یہ دلیل مغالطہ آفرینی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے، طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۱ء کے لمعات۔) اس وقت ہم صرف، وزیرِ اعظم پاکستان، مسٹر بھٹو کی تصریحات پر اکتفا کرتے ہیں۔

مسٹر بھٹو کی کتاب (THE GREAT TRAGEDY) جسے اردو میں "عظیم المیہ" کا نام دیا گیا ہے، کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ خود انہی کے پیش لفظ کے ساتھ اگست ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی

تھی۔ اس کتاب کے صفحہ اول پر مسٹر بھٹو آغازِ سخن ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ہمارا نقطۂ آغاز ۱۹۴۰ء ہے، جب ۲۳ مارچ کو مسلمانانِ ہند نے قائداعظم کے زیرِ قیادت پاکستان کا مطالبہ کیا۔ یعنی برصغیر میں ایک الگ آزاد مملکت کا مطالبہ۔ یہ مطالبہ اس ریزولیوشن میں درج تھا جسے لاہور ریزولیوشن کہا جاتا ہے۔ اور فضل الحق صاحب نے (جنہیں شیرِ بنگال کہہ کر پکارا جاتا تھا) پیش کیا تھا۔

گزشتہ چند سالوں میں اس ملک کے دو بازوؤں میں باہمی مناقشت کی وجہ سے اس ریزولیوشن کے متعلق ایک تلخ سی بحث کا آغاز ازسرِنو کر دیا گیا ہے۔ پہلے ۱۹۶۶ء میں شیخ مجیب الرحمٰن نے اور پھر مولانا بھاشانی نے کہا کہ لاہور ریزولیوشن میں دو آزاد مملکتوں کا تصور موجود ہے۔ ایک مشرقی بازو میں اور ایک مغربی بازو میں۔

یہ لاہور ریزولیوشن کی دیانتدارانہ تعبیر نہیں۔

تاسیسِ پاکستان کے وقت سے لے کر ۱۹۶۶ء تک کسی نے بھی اس ریزولیوشن کو سنجیدگی سے یہ معنی نہیں پہنائے تھے۔ لاہور ریزولیوشن سے مقصود یہ تھا کہ پاکستان میں پورا پنجاب ..... پورا بنگال اور آسام مدغم کر دیا جائے۔ چونکہ (آخر الامر) پنجاب اور بنگال تقسیم ہو گئے اور آسام پاکستان کو مل ہی نہ سکا تو تشکیلِ پاکستان کے وقت لاہور ریزولیوشن کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا۔ علاوہ بریں اس بحث کا ملخص اس حقیقت میں مضمر ہے کہ جب انگریزوں نے انڈین انڈی پینڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء کی رو سے اقتدار کو منتقل کیا ہے تو اس وقت تین آزاد مملکتیں تخلیق نہیں کی گئی تھیں صرف دو ہی کی گئی تھیں۔ ایک انڈیا اور دوسری پاکستان۔

مسٹر بھٹو کی اس کتاب میں صرف یہی ایک مقام نہیں جہاں کہا گیا ہو کہ لاہور ریزولیوشن سے مراد ایک آزاد مملکت کا قیام تھا، دو کا نہیں۔ اس میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے مثلاً ص۲ پر مشرقی پاکستان کے ابتلاء ۱۹۷۱ء کے حوادث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

۲۳ مارچ یومِ پاکستان تھا۔ اکتیس سال ہوئے اس دن لاہور ریزولیوشن پاس ہوا تھا جس میں برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک الگ رہائش گاہ (HOME LAND) اور آزاد مملکت پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

پاکستان، مشرقی پاکستان کے باشندوں پر جبراً مسلط نہیں کیا گیا تھا۔ ان تمام صوبوں نے جن کے مجموعہ کا نام پاکستان ہے، رضاکارانہ طور پر ایک آزاد مملکت کے قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ (ص۵۲)

کتاب کے آخری صفحات میں رقمطراز ہیں:۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ ہماری داستان کا نقطۂ آغاز ۱۹۴۰ء کا لاہور ریزولیوشن

ہے۔ یہ تاریخ محض اتفاقی سی ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھیے تو پاکستان کا آغاز ایک ہزار سال پہلے ہو چکا تھا۔ جب محمد بن قاسمؒ نے سندھ کی سرزمین پر قدم رکھا اور اس برصغیر میں اسلام کی شمع روشن کی۔ اس زمانے سے اس برصغیر میں ہندو اور مسلمان دو الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ آزاد مملکتوں کی تخلیق درحقیقت اسی قدیم تقسیم کی رسمی شکل تھی۔ پاکستان قائم رہنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ (ص۸)

اور آخری صفحہ پر کہا گیا ہے:۔

اب وقت آگیا ہے کہ تمام دنیا پاکستان کو ایک غیر منقسم وحدت کی حیثیت سے تسلیم کر لے۔ اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے تو پھر باقیماندہ برصغیر بھی متحد اور سالم نہیں رہ سکے گا۔

یاد رکھیے:۔

مشرقی پاکستان، پاکستان کا اٹوٹ انگ ہے۔ (ص۸۹)

دیگر مختلف مقامات پر مشرقی اور مغربی پاکستان کو پاکستان کے دو بازو کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) تقسیم ہند کے فوری بعد زبان کے مسئلہ پر ملک کے دو بازوؤں کے درمیان تلخی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ (ص۳)

(۲) ون یونٹ نے اس تلخی میں اضافہ کر دیا اور یہ دونوں بازو ایک دوسرے کو دو متحارب مملکتوں کی حیثیت سے دیکھنے لگ گئے۔ (ص۵)

(۳) میرے خلاف یہ پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ میں دو پاکستان بنانا چاہتا ہوں۔ (ص۳۶)

(۴) میں نے یحییٰ خان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں مجیب کی اسکیم کے لئے پارٹی نہیں بننا چاہتا کیونکہ اس کا فطری نتیجہ دو پاکستان ہوگا۔ (ص۵۴)

بحیثیت صدر پہلی تقریر میں

"عظیم المیہ" اگست ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب مسٹر بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو قوم کے نام اپنی پہلی نشر شدہ تقریر میں کہا کہ:۔

میرا اور میرے دوستوں کا دل، مشرقی پاکستان میں ہمارے بھائیوں اور ہمارے عوام کے ساتھ ہے۔ مشرقی پاکستان، پاکستان کا ایسا حصہ ہے جو نہ کبھی الگ ہو سکتا ہے نہ تحلیل ہو سکتا ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۲۲-۱۲)

یہ ہے خود وزیر اعظم پاکستان، مسٹر بھٹو کے نزدیک، ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کی دیانتدارانہ تعبیر۔ اس تعبیر کی رُو سے مجیب اگر غدارِ وطن قرار نہیں پاتا تو وہ اور کیا ہے؟ ہم چاہتے تھے کہ مجوزہ مسلم سربراہی کانفرنس میں اس غدار کے خلاف متفقہ طور پر نفریں کا ووٹ پاس کیا جاتا تاکہ اُسے اپنے کیے پر کچھ تو ندامت

محسوس ہوتی، اور اس کے بعد اس قسم کے عزائم رکھنے والے دیگر دشمنانِ ملت کو (خواہ وہ کسی جگہ ہوں) اس سے عبرت حاصل ہوتی۔ لیکن اس کے بجائے یہاں کوشش یہ ہو رہی ہے کہ اسے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جائے، اور نہ صرف دعوت دی جائے بلکہ اس کے لئے اُسے آمادہ کیا جائے اور اس کی شرائط بھی مان لی جائیں۔ چونکہ ان سطور کے سپردِ قلم کرنے تک اس داستان کا آخری باب ہمارے سامنے نہیں آیا (یعنی یہ معلوم نہیں کہ اس تگ و تاز کا آخری نتیجہ کیا ہوگا) اس لئے ہم اس کے متعلق مزید کچھ کہنا قبل از وقت سمجھتے ہیں۔ (۱۶ فروری ۱۹۷۶ء)

—— (۰) ——

غیر مستطیع

ہمارے پاس اکثر ایسے احباب
ان میں اتنی استطاعت نہیں ہو
ہے کہ اگر ایسے غیر مستطیع شائق

روپے اپنی طرف سے ادا کر دیں گے اور یوں اُن کے نام سال بھر کے لئے طلوعِ اسلام جاری ہو جائے گا۔
سرکاری اور دینی درس گاہوں کے طلباء نیز ائمہ مساجد و اساتذہ حضرات کو ترجیح دی جائے گی۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے والے حضرات ساڑھے سات روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔ رسالہ اُن کے نام سال بھر کے لئے جاری کر دیا جائے گا۔
(ناظم - ادارہ طلوعِ اسلام)

ضروری اعلان

ادارہ کی نئی کتاب "شاہکارِ رسالت" منگانے کے لئے مبلغ ۳۷/- روپے منی آرڈر کریں۔ کتاب کی قیمت مبلغ ۳۵/- روپے۔ اور ڈاک خرچ ۲/- روپے ہے (ناظم)

سنہ ۱۹۴۰ء کا ریزولیوشن کن حالات میں پاس ہوا تھا

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی اہمیت آپ کے سامنے آ چکی ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم (یا کم از کم یاد) ہوگا کہ وہ حالات کس قسم کے تھے جن میں وہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس کی تفصیل اسی زمانے میں طلوع اسلام میں شائع ہوئی تھی۔ موقعہ کی مناسبت کے لحاظ سے آپ بھی اس کی ایک جھلک دیکھ لیجئے۔ طلوع اسلام نے لکھا تھا:-

"اللہ رے بساطِ سیاست کی فسونگرانہ چیرہ دستیاں! مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی دھوم مچی۔ دہلی کے اربابِ حل و عقد کی آنکھیں ایک طرف منٹو پارک[1] (لاہور) کی طرف لگ رہی تھیں۔ رام گڑھ[2] میں جمع ہونے والے گنگا جمنی مہاشوں کے کان دوسری طرف ہر تیر کھٹکنے پر کھڑے ہو رہے تھے۔ انگریز کو اپنی ساحرانہ فسوں سازیوں کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ہندوؤں کو رام راج کے منصوبے خواب پریشاں بنتے نظر آ رہے تھے۔ وہ متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمیں کہ جس کے حلقے انگریز کی ہوسِ استعمار پرستی کے ریشوں سے بٹے اور ہندو کے جذبۂ مسلم کشی کے ہاتھوں کسے گئے، تارِ عنکبوت بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جداگانہ قوم کے لئے ایک جداگانہ حکومت کے تصورات میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑنے والی تھی۔ سرزمینِ پنجاب کا ایک ایک ذرہ ابھر ابھر کر اس مارچ کے استقبال کے لئے ہمہ تن چشم بن رہا تھا۔ ہندوستان کے ہر مسلم گھرانے میں اس تقریب کی آمد آمد پر شبِ عید کا سماں بندھ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے خاص تیاریوں کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں جو اس امر کی آئینہ دار تھیں کہ لاہور لوکر وڑ فرزندانِ توحید کی نگاہوں کا مرکزِ جانفزا بن رہا ہے۔ غرضیکہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ہر دھڑکنے والا قلب محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کے سمائے سیاست پر ایک آفتاب تازہ کے طلوع کے سامان ہو رہے ہیں۔ شپرہ چشم غیروں کو اس آفتاب جہاں تاب کی ضوفشانیوں سے جو گھبراہٹ ہو رہی تھی وہ بالکل بجا اور درست تھی۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کی شور بختی کہ خود اپنوں میں سے بھی کچھ ایسے تھے جو اس تقریب کی کامیابی میں اپنے طرۂ امتیاز کی خمیدگی محسوس کر رہے تھے۔ جو سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کا یہ عدیم النظیر اجتماع اور اس اجتماع کے تحیر انگیز نتائج ان کے چہروں کو بے نقاب کر دیں گے، صفِ مخالف کی بھانپنے والی نگاہوں نے ان کے چہروں کی اس اڑتی ہوئی رنگت کو دیکھا اور ایک نرم رو قاصد[3] لاہور بھیجا گیا۔ تخلیہ میں وہ ملاقات ہوئی جس کی تفصیل کے متعلق۔ کراماً کاتبین راہم خبر نیست۔ اجلاس کی تاریخیں قریب تر آ گئیں۔ لوگوں کے ولولۂ شوق میں اگر موشی بڑھتی گئی۔ تیاریاں زور پکڑتی گئیں۔ آنے والے منظر کا تصور نگاہوں میں

---

[1] جہاں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔
[2] جہاں کانگریس کا سالانہ جلسہ زیرِ صدارت ابو الکلام صاحب آزاد۔
[3] ابو الکلام صاحب آزاد جنہوں نے سر سکندر حیات سے ملاقات کی تھی۔

چمک، قلوب میں مسرت آفریں تموج اور دماغوں میں کیفِ عجیب پیدا کرنے لگا۔ حوصلوں نے انگڑائیاں لیں۔ ولولوں نے کروٹ بدلی۔ ہمتیں آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہوئیں۔ عزائم نے قدم بڑھایا۔ ارادوں نے کمرِ ہمت باندھی اور یہ قافلۂ شوق رواں دواں جادہ پیما ہوا۔

ادھر یہ گرمجوشیاں تھیں اور ادھر بعض چہروں کے ہلکے ہلکے تبسمِ پنہاں، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کر رہے تھے۔ لیکن کیفِ عزائم میں سرمست کاروانِ شوق کو فرصت کہاں کہ پردوں کے ارتعاشِ غیر محسوس سے منظرِ پسِ پردہ کا جائزہ لے۔ وقت گزرتا گیا۔ مہینے ہفتوں میں بدلتے گئے کہ عین شروع مارچ میں حکومتِ پنجاب کے قصرِ فلک بوس سے جماعتِ خاکساراں پر پابندیاں عاید کرنے کے احکامات نافذ ہو گئے۔ لیکن اس کاروانِ شوق نے اس پر بھی نہ سمجھا کہ

تیرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

مہینے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ خاکساروں کے خلاف پابندیوں نے فضا میں کچھ تموج پہلے سے پیدا کر رکھا تھا۔ کہ جلوسِ صدرِ مسلم لیگ کے عین دو روز پہلے شام کے قریب یہ خبر آگ کی طرح اطراف و اکنافِ ہند میں دوڑ گئی کہ لاہور میں خاکساروں پر گولی چلا دی گئی ہے۔ تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ کرفیو آرڈر جاری ہو گیا۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ شہر پر فوج اور پولیس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ ساری آبادی پر بلا کا سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص ہراساں۔ ہر متنفس متوحش۔ نہ باپ کو بیٹے کی خبر۔ نہ بھائی کو بھائی کا علم۔ کاروبار بند۔ دل پژمردہ۔ ہمتیں پست۔ ولولے افسردہ۔ اجلاس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا اور لاہور کی یہ حالت! شریک ہونے والوں میں سے کچھ اپنے اپنے مقام سے روانہ ہو چکے۔ کچھ ٹکٹ بدست، اسٹیشنوں پر بیٹھے۔ کچھ راستے کے مقامات میں وقتی آرام کے لئے ٹھہرے ہوئے۔ ہر ایک حیران کہ اب کیا ہوگا۔ ہر ایک پریشان کہ اب کیا بنے گا۔ صدرِ جلسہ دہلی میں ہیں۔ استقبالیہ کمیٹی لاہور میں۔ تار پر تار آ رہے ہیں۔ ٹیلیفون پر ٹیلیفون ہو رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے بعد میں بتایا، انہیں نہایت "مخلصانہ" مشورہ دیا گیا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ پریشانی اور وحشت کے یہ سامان ایک طرف، اور وہ عزم و ہمت کا پیکر دوسری طرف کہ ناسازگاریٔ حالات کی تیز و تند موجیں اٹھتی ہیں اور اس روشنی کے بلند و محکم مینار سے ٹکرا کر خاسر و نامراد واپس لوٹ آتی ہیں۔ فی الحقیقت ایک اولوالعزم انسان کے امتحان کا اس سے زیادہ نازک موقعہ کم ہی آیا ہوگا۔ اس پیکرِ استقلال کے مجسمہ نے یہ سب کچھ سنا اور دیکھا لیکن اپنے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی کہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر ایسے نازک وقت میں اس کا پاؤں پھسل گیا تو مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا آبگینۂ حیات اس کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جائے گا۔ اس نے ان تمام پریشانیوں کے ہجوم کو جھٹک کر الگ کر دیا اور ۲۰ کی سہ پہر کو اعلان کر دیا کہ لیگ کا اجلاس ہوگا اور اپنے معینہ نظام الاوقات کے مطابق، بلا رد و بدل ہوگا۔ البتہ اس حادثۂ الم انگیز کے پیشِ نظر جس نے مسلمانانِ ہند کے طرب آگیں قلوب کو کاشانۂ حزن و ملال بنا دیا ہے، جلوس نہیں نکالا جائے گا۔ اس اعلان کے ۲ گھنٹے بعد یہ پیکرِ عزم و استقلال حسبِ انتظاماتِ سابقہ، اسپیشل ٹرین کے ذریعہ عازمِ لاہور ہو گیا۔

لاہور پہنچکر قائدِ ملت نے کیا دیکھا؟ یہ تو ان کی چشمِ پرنم کے آنسوؤں سے پوچھئے کہ جن کے ایک ایک قطرہ

میں سینکڑوں قبائیں تڑپتی نظر آرہی تھیں۔ البتہ دو مردوں نے جو کچھ دیکھا اس سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ایک فرض کفایہ کی ادائیگی کے لئے لوگ اپنے آپ کو کھینچے ہوئے جانبِ قبرستان لئے جا رہے ہیں۔ چہرے اداس۔ دل پژمردہ آنکھوں میں آنسو۔ شہر میں ہُو کا عالم۔ ہر شخص ایک غیر محسوس خوف سے ہراساں۔ سینوں میں آہ و فغاں کا قیامت خیز تلاطم لیکن حلق "قانونی" پابندیوں کی ریشمی رسیوں میں جکڑا ہوا۔ دلِ اہلِ جاں گداز کی آتشِ خاموش سے سوختہ۔ لیکن لعب "آئینی" قیود کی مصیبت زانہ بندش سے سر بمہر کہ دھواں تک نہ نکلنے پاتے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے پاس نہیں جاتا کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ اگر کوئی ڈرتا کانپتا سہما ہوا چلا بھی گیا تو اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کوئی بھانپ تو نہیں رہا۔ کوشش کرتا ہے کہ کچھ کہے لیکن جذبات کا تلاطم اور عواقب کا خوف دامنگیر ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اس کی چشمِ حیرت سے ڈھلکتے ہوئے آنسو چپکے چپکے اس کے غم و الم کی داستانِ خونچکاں کا ایک ایک لفظ کہہ ڈالتے ہیں۔ سارا شہر ایک جیلخانہ معلوم ہوتا تھا کہ جہاں کا ذرہ ذرہ ایک مستقل پاسبان ہو۔ اِدھر اُدھر استقبال کے دروازے، نیم تیاریوں کی حالت میں، دو دن بیشتر کی افراتفری کے مرثیہ خواں۔ گری ہوئی جھنڈیاں۔ ٹوٹے ہوئے قطعات یوں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے جیسے کسی طوفانِ بلاخیز کے بعد بہہ جانے والے مکانات کے بقیہ آثار۔ کسی مکان سے ایک چیخ کی دردناک آواز، دو دن کے لٹے ہوئے سہاگ کی داستانِ الم انگیز سے فضائے آسمانی کو ماتم کدہ بنا رہی ہے۔ کسی گھر سے ضعف و نقاہت میں ڈوبی ہوئی آہِ لرزاں، ایک پیرانہ سال بیوہ کی زندگی کے آخری سہارے کے ٹوٹ جانے کی فریاد بن کر کنگورۂ عرش کو ہلاتے جا رہی ہے۔ کسی معصوم کے چہرے کی زردی اس کے تازہ داغِ یتیمی کا پتہ دے رہی ہے۔ کسی گوشے سے زخمیوں کے کراہنے کی صدائے دردناک اس حقیقت کی داستان سرا ہے کہ زندگی کا بوجھ انکے لئے کس قدر ناقابلِ برداشت بن چکا ہے۔ شہیدِ خاکساران کی خاک کے ذرات بیگناہ مسلمانوں کے خونِ ناحق سے رنگین تھا بظاہر مرتے لیکن فی الحقیقت جینے والوں کے دمکتے ہوئے چہرے اور چمکتی ہوئی پیشانیوں کی جیتی جاگتی تصویریں۔ اور ان سب کے ساتھ شاہی مسجد کے جنوبی مینارے کہ جن کی آنکھوں نے دو دن پہلے مظلوم مسلمانوں کو تڑپتے پھڑکتے، غلطیدۂ خاک و خون مسلح سپاہیوں کی وحشت اور درندگی اور ہوسِ خون آشامی کا نشانہ بن کر ذبح ہوتے دیکھا تھا، بحضورِ ربِ ذو الانتقام دستِ بدعا استادہ کہ اے خدائے رؤف و رحیم! صدقہ اس مردِ قلندر کے مقدس آنسوؤں کا جو آج ہمارے سایہ میں محوِ خواب ہے، سرزمینِ لاہور کو غرق ہونے سے بچا لے کہ اس سرزمین کے ذرات کو اس مردِ مومن (علامہ اقبال) کی کفش بوسی کی سعادت حاصل ہے جس نے تیرے بندوں کو تیرے نام پر کٹ مرنے کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلایا۔

———— (٠) ————

ہاں یہ تھا لاہور۔ اور یہ تھی اس کی فضا جس میں مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہوا۔ شروع ہوا تو اس افسردگی اور پژمردگی میں لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک مردِ مخلص کا یقینِ محکم و عملِ پیہم کس طرح نبضِ کائنات میں نئے سرے سے تموج پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا پنجۂ جنوں طاغوتی قوتوں کی فریب کاریوں کے دلآویز نقابوں کو کس طرح تار تار کر دیتا ہے۔ اس کا حسنِ تدبر سیاسی گتھیوں کی پیچ در پیچ گرہوں کو کس حسن و خوبی سے کھولتا جاتا ہے۔ ۲۱ مارچ کی شام کو پرچم لہرانے کی مختصر سی رسم میں اس مردِ مخلص نے آکر صرف اتنا ہی کہا کہ

میں ابھی ابھی میو ہسپتال سے اپنے جگر کے ٹکڑوں، اپنے زخمی بیٹوں کو دیکھ کر آرہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری مصیبت کس درجہ قیامت خیز ہے لیکن جذبات کے تلاطم میں نہ بہہ جاؤ مردانہ وار مقابلہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ مظلوم کی پوری پوری دادرسی ہوگی۔ حق وانصاف کا بول بالا ہوگا۔

کہنے والے نے کچھ ایسا ہی کہا۔ لیکن سننے والوں نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ ظلمت کدۂ لاہور پر نور کی کرنیں بن کر برسے جنہوں نے یاس و حزن کی وحشتناک تاریکی کا دامن چاک کر کے چاروں طرف شعاع امید دوڑا دی۔ دلوں میں پھر سے حرکت محسوس ہوئی۔ نگاہوں میں از سر نو روشنی پیدا ہو گئی۔ افسردہ چہروں پر خون لوٹ کے کچھ کچھ آثار نظر آنے لگے۔ در و دیوار سے زندگی کے نقوش پھر سے ابھر کر سطح پر دکھائی دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد کرفیو آرڈر کے انسانیت سوز بھیانک عفریت کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں منتشر دکھائی دینے لگے۔ اجتماعات پر جو پابندیاں عاید ہو چکی تھیں، ان کی رسیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ شہر والوں کے دلوں سے پھر سے خوف و ہراس کے تپ دق کے جراثیم دور ہوئے۔ قبرستان کے سے خاموش گلی کوچے پھر سے زندہ انسانوں کی بستیاں معلوم ہونے لگیں۔ پنڈال کی رونق بڑھی۔ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرے دن (۶ مارچ) بعد دوپہر کے پہلے کھلے اجلاس میں کم از کم پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ نواب سر شاہنواز خاں صاحب، صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ حسب دستور پہلے سے چھاپ رکھا تھا لیکن قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کسی کو یاد نہ رہا کہ اس میں سے وہ حصہ خارج کر دیا جائے جو خواہ مخواہ سرد پڑ ستاں یاد دہانی بن جائیگا۔ پڑھتے پڑھتے حکومت پنجاب کے "درخشندہ" کارناموں کا ذکر آیا تو ۴ مارچ کے حادثۂ محزنہ کی یاد نے لوگوں کے دلوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور پنڈال نفرین و لعنت کے تہلکہ انگیز نعروں سے گونج اٹھا۔ مسلمانان لاہور نے تین دن سے جن جگر گداز جذبات کو اپنے سینوں میں دبائے رکھا تھا، آج وہ پوری آزادی کے ساتھ باہر آگئے۔ مغموم دلوں کی وہ آتش خموش جو اتنے دنوں سے بایں نمط اندر ہی اندر سلگ رہی تھی کہ اس کا دھواں تک بھی اوپر نہ اٹھنے پائے، اس وقت اپنی پوری عناں تابی سے بھڑک اٹھی۔ یہ مظاہرہ محض رسمی نہ تھا کہ حلق کے اوپر سے آوازیں اٹھ رہی ہوں۔ یہ تو عمق قلب سے نکلی ہوئی آہیں تھیں جنہیں سنکر جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ سامنے تھا اور چشم فلک، عبرت و موعظت کے اس دلدوز منظر کو حیران و ششدر دیکھ رہی تھی کہ اللہ اکبر! یہ کیا انقلاب ہے؟ اس کے بعد ہوا کا رخ بدل گیا۔ اس خوف و ہراس کا ردعمل جس نے چار روز سے خطۂ لاہور کو وحشت کدہ بنا رکھا تھا، پورے جوش و خروش کی صورت میں رونما ہوا۔ گوشے گوشے سے "مردہ باد" کے نعرے سنائی دینے لگے۔ گلی کوچے سے لعنت وملامت کی آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں۔ اس کا انتظام تو کر لیا جا سکتا تھا کہ یہ چیزیں لاہور سے باہر کی دنیا تک نہ جانے پائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمانوں نے ان باتوں کو اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد تو رنگ ہی بدل گیا۔ کوئی جلسہ ایسا نہ تھا جس میں نفرت وملامت کے نعرے بلند نہیں ہوتے تھے۔ کوئی اجتماع ایسا نہ تھا جس میں خون شہداء کی قیمت، کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا۔ سبجکٹ کمیٹی میں پانچ پانچ گھنٹے تک بحث رہی تو اسی مسئلہ پر۔ کھلے اجلاس میں ہر دس منٹ کے بعد تقاضا ہوا تو یہی کار۔ دو دن تک یہی مطالبہ ہر شخص کی زبان پر تھا۔ اس ہنگامۂ بحث و جدل، اس سیلاب جوش و خروش میں مسٹر جناح نے جس ہمت، استقلال، عزم راسخ، تدبر، صلاحیت ضبط و انضباط کا ثبوت دیا۔ آنے والا مورخ

جب اسے دیکھے گا تو بلا تامل پکار اٹھے گا کہ فی الواقعہ ایک "قائد اعظم" کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ مبارک ہے وہ قوم جسے ایسا "رہبر فرزانہ" مل جائے اور مستحقِ صد تحسین ہے وہ انسان جسے مبدا فیض کی کرم گستری سے یہ نعمتیں یوں فراواں نصیب ہو جائیں۔ مکمل دو دن تک یہی ہنگامہ رہا۔ اور بالآخر ۲۴ مارچ کی شب، آخری کھلے اجلاس میں، جب کہ پنڈال میں کم از کم ایک لاکھ کا مجمع ہو گا۔ مجمع کیا، جوش و جذبات کا بحرِ متموج جو ہر متصادم عنصر کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانے کے لئے کف بر دہاں موجزن تھا۔ ایسے وقت میں خاکساروں کے حادثۂ فاجعہ کے متعلق ریزولیوشن پیش کرنا اسی صاحبِ ہمت، مرد دانا کا کام تھا جسے اللہ نے اس پیرانہ سالی میں وہ جرأت و حوصلہ دیا ہے جو نوجوانوں کو بھی شرما دے۔ صاحبِ صدر (قائد اعظم) نے اس ریزولیوشن کو پیش کیا اور اس درد و اثر میں ڈوبی ہوئی تقریر کے ساتھ جس کے لفظ لفظ سے اس کے قلبِ محزون کی تڑپ اور خلش ابلتی نظر آ رہی تھی۔ ریزولیوشن پیش کیا اور ایک لاکھ کے مجمع میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جس نے اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی اٹھائی ہو۔ صاحبِ صدر نے پوچھا کہ کیا یہ چاہتے ہو کہ اس پر کھلے اجلاس میں بحث و تمحیص ہو، لیکن سب نے کہا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس سے اندازہ فرمایئے کہ مسلمانوں کو اپنے اس ملی راہ نما پر کس قدر اعتماد ہے۔ وذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشآء۔

لیگ کے اجلاس کی ابتدا اور اختتام میں کیفیات و جذبات کا جو نمایاں فرق سامنے آیا اس سے یہ چیز بالکل نمایاں تھی کہ اب مسلمانوں میں کس قدر بیداری ہو چکی ہے اور مسٹر جناح کی عظمت کس قدر عوام کے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔

(٠)

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا وہ اس خون کی ہولی سے متعلق تھا جو ۱۹ مارچ کو لاہور میں کھیلی گئی لیکن مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی اہمیت صرف اس لئے نہیں کہ اس میں اس قیامت خیز سانحہ کے نتائج و عواقب کو اس حسن و خوبی سے سنبھالا گیا۔ لیگ کا یہ اجلاس فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں ایک تاریخی اجلاس تھا اور ہم تو یہ کہیں گے کہ وہ خوش نصیب مسلمان جنہوں نے اس اجلاس کو بچشمِ خویش دیکھا ہے وہ محسوس کریں گے کہ انہوں نے ان چار دنوں میں ایک قوم کی پوری تاریخ کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلم تھا جس میں پہلے یہ دکھایا گیا کہ ایک قوم جب طاغوتی طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوتی ہے تو اس پر کس قدر افسردگی چھا جاتی ہے۔ اس کے قوائے عملیہ کس قدر مضمحل ہو چکتے ہیں۔ اس کا دل آرزوؤں اور ولولوں کا نشیمن ہونے کے بجائے کس طرح حزن و یاس کا کاشانہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب اس قوم میں ایک رہبرِ فرزانہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ کس طرح پوری کی پوری فضا کو بدل کے قوم کے عروقِ مردہ میں نیا خون، نئی زندگی دوڑا دیتا ہے۔ مسلم لیگ کے متعلق آج تک یہ کہا جاتا تھا کہ بالآخر اس کے سامنے پروگرام کیا ہے۔ اس کی تگ و دو کا منتہی کیا ہے۔ اس کے سامنے نصب العین کون سا ہے؟ لاہور کے اجلاس نے صحیح اور بیّن الفاظ میں بتا دیا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے۔ ہم ایک عرصہ سے لکھتے چلے آ رہے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی گتھیوں کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں دوسرے حصۂ ملک سے الگ کر کے ایک جداگانہ حکومت قائم کی جائے۔ صدر مسلم لیگ، مسٹر جناح، گزشتہ دو برس سے جس نہج سے قدم اٹھاتے چلے آ رہے تھے، دیکھنے والی آنکھیں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں کہ ان کی منزلِ مقصود کیا ہے!

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح ——— اور ——— راشٹرپتی ابوالکلام آزاد

جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں، ہماری سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ابھی تک تحریکِ پاکستان کی کوئی ایسی قابلِ اعتماد تاریخ شائع نہیں ہوئی جس میں اس تحریک کی اساس اور مطالبہ پاکستان کے محرکات سے بحث کی گئی ہو۔ اس قسم کی تاریخ کے لئے بنیادی مسالہ طلوعِ اسلام (دورِ اول) کے فائلوں میں ملے گا۔ اس میں آپ کو نظر آئے گا کہ اس بحث کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی۔ مسلم لیگ (قائدِ اعظم) کا دعویٰ یہ تھا کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک جداگانہ، منفرد قومیت کے افراد ہیں اور غیر مسلم ان سے الگ قومیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس کانگریس کا دعویٰ یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام باشندے، وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک (متحدہ) قومیت کے افراد ہیں۔ قائدِ اعظمؒ اس نظریہ کی تبلیغ ۱۹۳۷ء سے کرتے چلے آ رہے تھے اور کانگریس کی طرف سے ان کی مخالفت بھی پہلو بہ پہلو چل رہی تھی۔ جب قائدِ اعظمؒ نے دیکھا کہ مسلمانوں کا ذہن اس نظریہ کے متعلق صاف اور پختہ ہو گیا ہے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس کی بنا پر مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ کا باضابطہ اعلان کر دینا چاہیے۔ اس کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ قرارداد منظور ہوئی جو مملکت پاکستان کی اساس قرار پائی۔ اس کانفرنس اور اس میں قائدِ اعظمؒ کے خطبہ صدارت کا تذکرہ تو ہمارے ہاں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہندو کی طرف سے اس کی مخالفت کس انداز سے ہوئی تھی۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ اس کانفرنس کی روئداد سے ساری دنیا کے سامنے یہ حقیقت آ جائے گی کہ ایک الگ قومیت اور اس بنا پر ایک الگ مملکت کا مطالبہ مسلمانانِ ہند کا متفقہ مطالبہ ہے۔ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہی دنوں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس منعقد کیا جائے اور اس کا صدر راشٹرپتی کسی مسلمان کو بنایا جائے جو اپنے خطبہ صدارت میں اس نظریہ کی مخالفت کرے۔ اس کے لئے قرعہ فال (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے نام پڑا جو ایک ممتاز عالمِ دین کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ یہ اجلاس رام گڑھ میں منعقد ہوا۔ لاہور کانفرنس میں قائدِ اعظمؒ کا خطبہ صدارت جہاں اس اعتبار سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا

ہے کہ اس میں اسلام کے اس بنیادی تصور کو (کہ معیار قومیت دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا) نکھار اور ابھار کر دنیا کے سامنے لایا گیا۔ اس کے مدمقابل مولانا آزاد (مرحوم) کا خطبۂ صدارت اس جہت سے اہم ہے کہ ہندو نے اسلام کے اس بنیادی نظریہ کی مخالفت کس انداز سے کرائی تھی (قائداعظم کا وہ خطبہ تو ہمارے ریکارڈ میں موجود ہے۔ لیکن مولانا آزاد کے اس خطبہ کا شاید کسی کو علم بھی نہ ہو۔ طلوع اسلام نے اپنی اپریل ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں جہاں مسلم لیگ کانفرنس کی روئداد شائع کی تھی، وہاں اپنے تبصرہ کے ساتھ مولانا آزاد کے خطبہ کے متعلق حصے بھی شائع کئے تھے۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ۲۳ مارچ (یوم پاکستان) کی تقریب کی نسبت سے اس تبصرہ کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ ہماری نئی نسل کو معلوم ہو سکے کہ تحریک پاکستان کی مخالفت کس کس گوشے اور کس کس انداز سے ہوتی تھی۔ مولانا آزاد (مرحوم) کے خطبہ صدارت پر طلوع اسلام کا تبصرہ حسب ذیل تھا۔

نظر بر

خطبۂ صدارت

راشٹرپتی مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد — کہ جبریل امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا — پرستد مومن و کافر تراشد

جیسا کہ ہم نے اشاعت سابقہ میں عرض کیا تھا۔ مولانا آزاد صاحب کے انتخاب صدارت سے ہمیں ایک خوشی ضرور ہوئی تھی۔ اور وہ یہ کہ اب خدا خدا کر کے وہ مُہر آز ما سکوت ٹوٹے گا جس نے بیس سال سے یہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی کہ

دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

چنانچہ لاہور کی تقریر کے بعد کانگرس کے اجلاس رام گڑھ کی تقریب پر مولانا صاحب کو خطبہ صدارت سنانا پڑا جس میں ان سے وہ کچھ کہلوایا گیا جس کے کہنے سے وہ اتنا عرصہ پہلو تہی کرتے چلے آرہے تھے۔ ہم کانگرس کے ارباب بست و کشاد کے رہین کرم ہیں کہ انہوں نے حضرت مولانا کو یہ اعزاز عطا فرما کر "سادگی و پرکاری" کے ان حسین و جمیل نظر فریب پردوں کو اٹھا دیا جن میں مولانا صاحب مدت سے چھپے بیٹھے تھے اور جس کی مرصع کاریوں کی بنا پر بہت سے ابلہ فریب حضرات بیچارے سادہ لوح مسلمانوں کو دام تزویر میں پھنسا لیا کرتے تھے۔ اب حقیقت بے نقاب ہو گئی اور کسی کو یہ کہہ کر دجل و تلبیس کا موقع نہ رہا کہ "ہاں حضرت مولانا

نے بھی ہم سے تخلیہ کی گفتگو میں یہی فرمایا ہے کہ "میرا عقیدہ بھی وہی ہے جو جمہور مسلمانوں کا ہے۔" اب پردے اٹھ گئے۔ اب مولانا صاحب کے خیالات کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ کیا یہ کانگریس کے ارباب حل و عقد کا کچھ کم احسان ہے۔

اس خطبہ کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے۔ آپ کو اللہ اور اس کے رسول کا نام کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ وہ مولانا آزاد کہ جن کی "عہد اسلامی" میں یہ حالت تھی کہ ہر دوسرے فقرے کے بعد آیت قرآنی اور ہر تیسرے جملے کے بعد کوئی حدیث مقدسہ آجاتی تھی، آج ان کی یہ حالت ہے کہ اللہ کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں، جھجکتے ہیں۔ اور تو اور خطبۂ صدارت کی ابتدا میں بسم اللہ تک بھی نہیں لکھی گئی۔

انقلابات ہیں زمانے کے

کہہ دیا جائے گا کہ یہ خطبہ چونکہ مختلف مذاہب و ملل کے لوگوں کے اجتماع میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس لئے اس میں قرآن و حدیث کی ضرورت نہ تھی۔ نہ ہی اس امر کی حاجت کہ اس کا آغاز خدا کے نام سے کیا جائے کیونکہ اس مجمع میں بہت سے ایسے سامعین بھی موجود تھے جو سرے سے خدا کی ہستی ہی کے منکر ہیں — بجا اور درست۔ یہی تو ہم کہتے ہیں کہ جب ایک مسلمان کو متحدہ قومیت کا چولہ پہننا پڑتا ہے تو اُسے اپنے اسلامی مقام سے ہٹنا ضرور پڑتا ہے۔ اور مسلمان جب اپنے اصلی مقام سے ہٹا تو پھر دنیاوی اصطلاح میں وہ کچھ بھی کیوں نہ بن جائے مسلمان باقی نہیں رہتا۔ مسلمان رہے تو اور کچھ نہیں تو آغازِ کلام تو اللہ کے نام سے کرے۔

—— (۵) ——

ہم اشاعت طلوع اسلام کی اس دو سالہ مدت میں متعدد مقامات پر "مولانا آزاد کے دور الہلال کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کر کے بتا چکے ہیں کہ ان کا موجودہ مسلک خود انہی کے سابقہ دور کے الفاظ میں کس قدر اسلام کے خلاف ہے۔ اگر ان تمام اقتباسات کو یکجا کر دیا جائے جو ہم اس ضمن میں متفرق طور پر پیش کرتے رہے ہیں تو وہ ایک ایسا مصفیٰ آئینہ بن سکتا ہے جس میں حضرت مولانا کے صحیح خد و خال نمایاں طور پر نظر آ سکتے ہیں۔ ان اقتباسات کے جواب میں ہمارے اکثر دوستوں نے ہمیں لکھا کہ مولانا صاحب اب ان پارینہ داستانوں سے تائب ہو چکے ہیں۔ یہ انسانی خیالات تھے جن میں ہر آن تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ہم ان کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ مولانا صاحب اپنے اُس وقت کے خیالات کی تائید میں ہمیشہ کتاب و سنت کی نصوص صریحہ پیش کیا کرتے تھے۔ اور اب موجودہ خیالات کی تائید میں جو ان کے دورِ اول کے خیالات سے بالکل متضاد واقع ہوئے ہیں کبھی بھولے سے بھی قرآن و حدیث کی سند نہیں لاتے۔ اس لئے یہ غلط ہے کہ مولانا صاحب پر جن حقائق کا اب انکشاف ہوا ہے، اُن کے پیش نظر وہ اپنے سابقہ اسلامی خیالات کو باطل سمجھتے ہیں۔ بلکہ الحمد کہ مولانا نے ہمارا یہ مشکل بھی حل کر دی اور اپنے اس خطبہ میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ میرا مسلک آج بھی وہی ہے جو الہلال کے زمانہ میں تھا فرماتے ہیں :-

مجھے معلوم نہیں آپ لوگوں میں کتنے ایسے آدمی ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گذر چکی ہیں جو آج

سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کریں۔ (خطبہ صدارت ص۲۰)

دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں۔

میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انہیں مخاطب کیا تھا آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے ان میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھی ہیں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے گذرتے ہی نہ رہے، میں ان کے اندر کھڑا رہا۔ اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں میرے لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انہیں دعوت دی تھی۔ (ص ۳۵)

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ لوگوں کو چاہئے کہ اپنا حافظہ تازہ کریں۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ حافظہ تازہ کرنے کی ضرورت مخاطبین کو ہے یا خود مولانا صاحب کو؟ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صاحب کے پاس الہلال کا کوئی پرچہ بھی موجود نہیں۔ ورنہ وہ اس بلند آہنگی کے ساتھ یہ دعوے کبھی نہ کرتے کہ جو کچھ میں ۱۹۱۲ء میں کہتا تھا آج بھی وہی کہتا ہوں۔ آیئے ہم مولانا صاحب کو بتائیں کہ وہ ۱۹۱۲ء میں کیا کہتے تھے اور آج کیا کہہ رہے ہیں۔ مولانا صاحب ذرا توجہ سے سنیں کہ بڑی گہری تفکر طلب باتیں ہیں۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس تمام خطبہ میں کہیں اللہ اور اس کے رسول کا نام نہیں آیا۔ اسلام کے کسی بزرگ کی جلالت وعظمت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بھولے سے بھی کسی اسلامی تاریخی واقعہ کا اشارہ تک نہیں آنے پایا۔ لیکن اس میں اگر کسی کی عظمت کا اعتراف ہے تو (نعوذ باللہ) اس "وجودِ اقدس و اعظم" کی عظمت کا جو منزہ عن الخطاء قرار پا جانے کی وجہ سے ہر نیشنلسٹ کے نزدیک خدائی صفات کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ (ص ۲۱)

مہاتما گاندھی۔ عظیم روح۔ اللہ اکبر!!!

کبھی مولانا صاحب روح کی عظمت ورفعت کا یہ معیار قرار دیا کرتے تھے۔

اولیاء اللہ کا گروہ جس قدر محبتِ الٰہی اور انقطاع ماسوی اللہ میں ترقی کرتا ہے اتنا ہی اس کے اعمال میں اخلاقِ الٰہی اور نورِ ربانی کا ظہور بھی ترقی کرتا ہے۔ اور ان کی روح فیضانِ الٰہی سے نزدیک تر ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تکمیل مرتبہ انسانیت تک اس کا ارتفاع ہو جاتا ہے اور یہی "صراط مستقیم" اور "دینِ قیم" کا آخری مرتبہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ (یہ) وہ قانونِ ارتقاء ہے جسے محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا۔ (الہلال۔ مورخہ ۹ ؍ اگست ۱۹۱۲ء ص ۱۳)

سن لیا آپ نے کہ مولانا صاحب اپنے پیر و مرشد گاندھی جی کے متعلق کیا ایمان رکھتے ہیں! اور ان کا مقام کن فلک پیما بلندیوں پر سمجھتے ہیں!

ہندوؤں کا یہ دعویٰ ہے کہ کانگرس ملک کی "قومی جماعت" ہے۔ اور اس کے سوا اور جتنی جماعتیں ہیں وہ فرقہ وارانہ ہیں۔ ان فرقہ وارانہ جماعتوں کی جدوجہد اپنے اپنے فرقہ کے مفاد کے لئے ہے۔ اس لئے جو کچھ کانگرس کر سکتی ہے یہ جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ یہی الفاظ مولانا صاحب کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں۔ لکھا ہے۔

بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں جہاں تک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لئے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورت حال کی تبدیلی کے خواہشمند ہوں۔ (ص ۲۳)

یعنی جو کچھ کانگرس کر سکتی ہے وہ فرقہ وارانہ جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ اب سنئیے کہ دورِ اوّل میں مولانا صاحب کیا فرماتے تھے۔

کانگریس کمیٹیاں جو کام کر رہی ہیں ان میں ہندی مسلمان بھی ہندوؤں کے برابر کے شریک ہیں لیکن خاص مسلمانوں کے اندر سرگرمی عمل پیدا کرنے کے لئے کانگریس کا نظام کافی نہیں ...... کانگریس کمیٹیاں کسی شہر یا بستی میں پچاس جلسے منعقد کر کے مسلمانوں سے کہیں کہ چرخہ چلاؤ اور ولایتی کپڑا چھوڑ دو تو وہ اثر پیدا نہیں ہوگا جو خلافت کمیٹی جمعہ کے دن مسجد میں ایک وعظ کر کے پیدا کر سکتی ہے۔

(مضامین ابو الکلام آزاد ص ۱۹۲۱ء)

اس وقت یہ ارشاد تھا۔ آج اگر کوئی جماعت خالص مسلمانوں کے اندر سرگرمی عمل پیدا کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے تو اُسے فرقہ وارانہ قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کرنے کا فتویٰ صادر فرما دیا جاتا ہے اور اس پر دعویٰ ہے کہ میں اس مقام سے بول رہا ہوں جہاں دورِ الہلال میں کھڑا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی کشمکش میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ میں جو بنیادی اختلاف ہے اُسے چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:۔

(۱) ہندو اس تمام ملک کو ایک "واحد کُل" (SINGLE UNIT) قرار دے کر ایک ایسے طرزِ حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں جس میں مرکز (CENTRE) ایک ہو۔ اس نظامِ حکومت کا نام آل انڈیا فیڈریشن ہوگا جو خالصتہً مغربی انداز کے نظامِ جمہوری کے قالب میں ڈھلا ہو۔

اس کے برعکس، مسلمان یہ چاہتا ہے کہ ملک کے اس حصہ کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ الگ کر کے وہاں جداگانہ اسلامی حکومت قائم کی جائے۔

(۲) ہندو تمام ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے وحدتِ قومی (SINGLE NATIONALITY)

کی بنیادوں پر نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے آپ کو ایک الگ جداگانہ مستقل بالذات قوم قرار دیتے ہیں اور ہندوستان کے مسئلہ کو بین الفرق (INTER - COMMUNAL) نہیں بلکہ بین الاقوامی (INTER - NATIONAL) مسئلہ سمجھتے ہیں اور دو جداگانہ قوموں کی بنیادوں پر الگ الگ حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مسائل اس قدر وضاحت سے طلوع اسلام کے صفحات پر آچکے ہیں کہ ان پر اس وقت مزید بحث ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولانا صاحب ان مسائل کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

ہندوستان کا آئندہ دستورِ اساسی (CONSTITUTION) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (FEDERATION) کا جمہوری دستور ہوگا جس کے تمام حلقے (UNIT) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع (DEFENCE) کسٹم وغیرہ (ص ۳۱-۳۲)

یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی نظامِ زندگی ہے جو یورپ کی "کمسانوں سے مضطرب" ہو کر آیا ہے۔ اور ہندو اسے اس لئے اختیار کرنا چاہتا ہے کہ اس کی رو سے وہ یہاں اپنی اکثریت کی بنا پر خالص ہندو راج قائم کر سکتا ہے۔ اب دیکھئے کہ یورپ کی نقالی میں نظامِ زندگی اختیار کرنے کے متعلق مولانا صاحب کبھی کیا فرماتے تھے۔ جمعیۃ العلمائے لاہور کے خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۲۱ء کے دوران میں ارشاد ہے۔

قوم افراد سے مرکب ہے اور افراد کی قومی ہستی کے قیام و ظہور کے لئے ضروری ہے کہ ایک جماعتی مسلک میں تمام افراد منسلک ہو جائیں اور فرقہ و تشتت کی جگہ وحدت و اتحاد پر افرادِ قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر اسلام نے بھی حیاتِ اجتماعی کے لئے کوئی نظام ہمیں دیا تھا یا نہیں! اگر دیا تھا اور ہم نے ضائع کر دیا ہے تو یورپ کی دریوزہ گری سے پہلے اسلام کا قرار دادہ جماعتی نظام کیوں نہ قائم کریں۔

کیا مولانا صاحب ارشاد فرمائیں گے کہ وہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے جس قسم کی جماعتی نظام کے قیام کی تلقین کر رہے ہیں وہ یورپ کی نقالی ہے یا اسلام کا عطا فرمودہ نظامِ حکومت؟ کیا وہ نظامِ زندگی یا طرزِ حکومت کبھی اسلامی قرار پا سکتا ہے جو کفار اور مومنین کی متحدہ قومیت سے وجود میں آئے اور جس میں فیصلے کفار کی اکثریت کے تابع ہوں؟ ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کس چیز کو اسلامی قرار دے رہے ہیں؟ کیا یہ وہی چیز نہیں جسے قرآنِ کریم طاغوتی نظامِ زندگی قرار دے رہا ہے اور جسے کانگریس نے یورپ کی دریوزہ گری سے حاصل کیا ہے؟ اس قسم کے فیڈرل نظام میں جہاں مختلف حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے وہاں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت کی کیا حالت ہوگی؟ اس کی بابت پوچھئے ان سیاہ اوراق سے جن پر آپ کی کانگریس کے اڑھائی سالہ عرصۂ حکومت کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں اور پھر آپ کس بھولے پن سے ارشاد فرماتے ہیں کہ

مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات۔ دفاع۔ کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے سامنے رکھ سکتا ہے ان اندیشوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے جنہیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُرفریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ص ۳۲)

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک، بیرونی تعلقات اور دفاع (DEFENCE) وغیرہ کچھ ایسے اہم مسائل نہیں کہ جن سے خواہ مخواہ کے اندیشے پیدا کئے جائیں۔ یہ "بیرونی تعلقات" جسے اب اکثریت اور اقلیت کے پرفریب سوال کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے۔ الہلال کے مولانا صاحب کے نزدیک کیا معنی رکھتے تھے۔ سنیئے۔ فرماتے ہیں۔

وہ پس اے عزیزانِ ملت اور اے بقیۂ ماتم زدگانِ قافلۂ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پرستِ توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامیٔ وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعتِ نزع میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظینِ کلمۂ توحید کے تمرّد اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں، تو ہم اللہ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسولؐ کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیرووں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیئے کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملتِ اسلام ایک جسمِ واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضا و جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضا کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔ اور یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں محض اظہارِ مطلب کا زورِ بیان نہیں ہے بلکہ عین ترجمہ ہے اس حدیثِ مشہور کا جس کو امام احمد و مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا۔

مثل المؤمنین فی توادھم و تراحمھم و تعاطفھم مثل الجسد اذا اشتکیٰ لہٗ عضوٌ تداعیٰ لہٗ سائر الجسد بالسھر والحمّیٰ (الحدیث)

مسلمانوں کی مثال باہمی مودت و رحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسمِ واحد کی

اگر اُس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس میں شریک ہو جاتا ہے۔

اور اسی کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے جس کو ابو موسےٰ اشعری نے روایت کیا ہے کہ:۔

المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا۔

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے۔ جیسے کسی دیوار کی اینٹیں کہ ایک اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے۔

اور فی الحقیقت یہ خصائص مسلم میں سے ایک اولین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اپنے جامع و مانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸ : ۲۹)

کافروں کے لئے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد۔

ان میں جس قدر سختی ہے باطل اور کفر کے لئے۔ اور ان کی جس قدر محبت اور الفت ہے حق و صداقت اور اسلام و توحید کے لئے۔ فاعتبروا یاایھا المسلمون ولا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وھم لا یسمعون۔ "

یہ ہیں وہ بیرونی تعلقات جن کا آج یوں استخفاف کیا جا رہا ہے۔ سچ ہے یُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، سیاست حاضرہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم کے افراد ہیں یا مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندو تمام باشندگان ملک کو ایک "متحدہ قومیت" کے عناصر ترکیبی قرار دیتا ہے اور مسلمان کا دعویٰ ہے کہ

بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اس لئے مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ لیکن ہندو اسے تسلیم نہیں کرتا اور مسلمان کو ایک اقلیت قرار دیتا ہے۔ مولانا صاحب نے اس باب میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ ان کی پریشانی افکار کا ایک کھلا ہوا صحیفہ ہے جس کا لفظ لفظ اس کشمکش کا غماز ہے جو ان کے ضمیر اور مصلحت کوشی میں جاری ہے۔ انہیں مسلمانوں کو اقلیت قرار دینے کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی اس لئے انہیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔

وہ ہیں نے اس زمانہ (زمانہ الہلال) میں بھی اپنے اس عقیدہ کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات کبھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اس لئے انہیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر

غلط دیواریں کھینچی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر اُن کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بنیادی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی ؟ درحقیقت یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس لئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی ....

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، اُن میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کا جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو، لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اُسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیئے بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو۔ اور اتنی کم ہو کہ اُس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (NUMBER) کے ساتھ نوعیت (QUALITY) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے۔ ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ، دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اُسے ایک "اقلیت" فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (FACTORS) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے ؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اُس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اُسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلا شبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ اگر وہ سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انہیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انہیں ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔"

اِن تصریحات سے واضح ہے کہ مولانا صاحب کے نزدیک مسلمان اقلیت نہیں۔ اور اگر یہ اقلیت نہیں تولامحالہ ایک جداگانہ قوم ہیں، لیکن ایسا کہنے سے تو ان کی نیشنل ازم کی عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ وہ ایسا کس طرح کہیں؟ اور کہنا بھی چاہیں تو وہ جن کی نظر کرم نے انہیں "راشٹر پتی" کے منصب جلیلہ پر فائز المرام کیا ہے، وہ ایسا کیوں کہنے دیں! اس باب میں مولانا صاحب جس مشکل میں جا پھنسے ہیں، ان کی حالت قابل رحم نظر آتی ہے۔ اپنے خطبہ کے صفحات ۲۳ لغایت ۲۶ پر انہوں نے بار بار اس امر کی وضاحت کی ہے کہ کانگریس نے ہمیشہ اس بنیادی اصول کو سامنے رکھا ہے کہ ہندوستان میں جو دستور اساسی بنایا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیئے اور ان تحفظات کے جج خود اقلیت ہوں۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"آج بھی اس نے (کانگریس) نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا اعتراف کیا ہے... کہ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خاص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں۔"

قارئین کرام کو غالباً معلوم ہوگا کہ "تسلیم شدہ اقلیتوں" کی اصطلاح گاندھی جی کی وضع کردہ ہے اور اس کی تصریح میں انہوں نے مسلمان اور سکھوں کا ذکر نمایاں طور پر کیا تھا۔

اب ذرا اس قضیہ کے صغریٰ اور کبریٰ کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ نتیجہ کیا مرتب ہوتا ہے۔

(۱) مسلمان اقلیت نہیں ہیں — مولانا صاحب خود بدلائل و براہین ثابت کر رہے ہیں۔

(۲) مسلمان ایک الگ قوم بھی نہیں ہیں ۔ کہ اس طرح دو قوموں کا نظریہ درست ماننا پڑتا ہے جو بقول مولانا صاحب سرکاری دماغوں کا وضع کردہ نظریہ ہے۔

(۳) مسلمان ایک تسلیم شدہ اقلیت ہیں ۔ کہ یہ مولانا صاحب کے رہنما گاندھی جی کا ارشاد ہے جو مولانا صاحب کے نزدیک وحیٔ منزل سے زیادہ واجب التسلیم ہے

تو پھر عقل حیران ہے کہ بالآخر مسلمان ہیں کیا۔ ؟

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے
ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیئے

اگر یہ دانستہ فریب دہی نہیں تو خود فریبی کی اس سے زیادہ بین مثال بھی مشکل سے مل سکے گی۔

مولانا صاحب نے سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا ہے کہ جب مسلمان اتنی بڑی جماعت رکھتے ہیں۔ تو انہیں اپنے مفاد کے تحفظات کے متعلق ڈرنے کی کیا وجہ ہے! یہ دلیل بظاہر جتنی خوش آیند ہے درحقیقت اتنی ہی زیادہ پُرفریب بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ اتنی بڑی جماعت کو کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ جس قسم کا نظام جمہوری آپ یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں، اس میں اتنی بڑی جماعت ایک چوتھائی کی اقلیت بن کے رہ جاتی ہے۔ جب آپ ہندوستان کو ایک کل (UNIT) مان لیں اور تمام ملک کا ایک مرکز (CENTRE) قرار دے کر جمہوری نظام قائم کر دیں تو اس مرکز میں مسلمانوں کی حیثیت چوتھائی سے بڑھ کس طرح سکتی ہے۔ لہذا اکثریت کے فیصلے غیر مسلموں کے فیصلے ہوں گے۔ مولانا صاحب! مصیبت تو یہ ہے کہ یہاں لڑائی آ پڑی ہے آئینی جس میں آدمی گنے جاتے ہیں، تولے نہیں جاتے۔ اگر تولے جانے کا مسئلہ ہوتا تو پھر ڈرنے کی کیا بات تھی!

اب اس اہم موضوع پر آیئے جو اس تمام خطبہ کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمان ایک الگ قوم نہیں بلکہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا جزو لاینفک ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری راہ نمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (FACTOR) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان

قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد دوسرا - یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک حجازی قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے یہاں بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم پر مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اُسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔" (صفحہ ۳۶-۳۷)

(۲) کانگریس جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے۔" (صفحہ ۲)

(۳) یہ تخیل کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں، سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے۔ (صفحہ ۲۸-۲۹)

"متحدہ قومیت" کے اس اصول کی وضاحت مندرجہ صدر الفاظ میں کی گئی ہے۔ اس مرصع غزل کا آخری شعر بھی سنتے جائیے۔ فرماتے ہیں:-

"ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مُہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہئے۔" (صفحہ ۳۹)

اللہ اکبر! کفار اور مسلمان ایک ملک میں رہنے کی وجہ سے ایک ناقابلِ تقسیم قوم بن جاتے ہیں! کفر و اسلام ایک جگہ اکٹھے ہو کر ایک نئی تہذیب میں تحلیل ہو سکتے ہیں! یہ قدرت کا اٹل قانون ہے! یہ تقدیر کا فیصلہ ہے! اس پر قسمت کی مُہر لگ چکی ہے۔ اس متحدہ قومیت کو خود دستِ قدرت نے تیار کیا ہے! مسلم و کافر کی علیحدگی کا تخیل بناوٹی ہے۔!!

یا اللہ! یہ ہم کیا سن رہے ہیں! اور کس سے سن رہے ہیں۔!

یہ وہ آواز سن رہے ہیں جس کے مٹانے کے لئے حضرت نوحؑ سے لے کر حضور خاتم النبیین تک انبیاء کرام کا پورا سلسلہ۔ پیغامِ خداوندی کو لے کر ظلمت کدۂ عالم میں آتا رہا۔ اور سن رہے ہیں اس شخص کی زبان سے جس کی ساری "اسلامی عمر" اس پکار میں گزر گئی کہ یاد رکھو۔ قومیت پرستی کی یہ آواز بلا شائبۂ تشکیک شیطان کی آواز ہے۔ اس کے فریب میں آجاؤ گے تو سیدھے جہنم کے عمیق گڑھوں میں جا گرو گے۔ اور ہاں! بدبختی یہ کہ یہ آواز اسی زبان سے سُن رہے ہیں جو آج بھی دعویٰ کرتا ہے کہ

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔" (صفحہ ۳۶)

ہم حیران ہیں کہ کفر و باطل کے اس اسلام سوز نظریہ کی تردید میں الہلال کے کتنے اقتباسات پیش کریں۔ اس کے تو پورے کے پورے مجلدات اس ایک دعوت کے نقیب ہیں کہ:-

مسلمانوں کی قومیتِ صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔" (خطبۂ صدارت مولانا آزاد ۱۹۲۱ء)
اس کا تو ایک ایک ورق، ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ اس دجل و فریب کی دھجیاں بکھیرنے کے لئے تھا کہ دنیا نے جس قدر قومیتوں کی بنیادیں وضع کی ہیں سب ابلیسانہ حیلہ کاریاں ہیں مسلمانوں کی قومیت کا مدار صرف مذہب ہے۔ اللہ کا قانونِ ابدی ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ہم فی الواقعہ متحیر ہیں کہ کون کون سے اقتباسات پیش کریں اور کہاں کہاں کے حوالے دیں چند ایک اقتباسات ملاحظہ کیجئے:۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ انبیاء کرام کا سلسلۂ رشد و ہدایت اسی دعوت کے نشر و اشاعت کے لیے دنیا میں قائم ہوتا رہا ہے کہ وہ انسانی رشتۂ قومیت کے ان تمام غیر فطری معیاروں کو منہدم کر دیے جو رنگ، نسل۔ وطن کے بولہبی تصورات سے وضع ہوتے ہیں۔ اور اُن کی جگہ صرف ایک معیار قومیت کو باقی رکھے جو اللہ کا متعین فرمودہ ہے۔ اور وہ معیار حقہ ہے اشتراکِ عقائد۔ یعنی مذہب۔ "عہد اسلامی" کے مولانا آزاد اس باب میں فرماتے تھے۔

وہ انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و ہتوا صل علائق نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ انبیائے کرام کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازاتِ قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں پس اس بناء پر ان کی دعوت کا اولین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اس طرح نسلی قربانی کا طاقت درجہ تیار کریں۔ اس قربانی کا اثر ان کے تمام کاروبار دعوت میں سب سے زیادہ کارکن ہوتا ہے۔ قوم دیکھتی ہے کہ کس طرح داعی الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اجاڑ دیا اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا جس کی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے۔

چنانچہ انبیاء کرام و رسلِ عظام کے اس سلسلہ میں جنھوں نے نئی قومیتوں کی بنیاد رکھی ہے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا مقام ہے۔ اور چونکہ ان کی دعوت اسی پہلی قسم کی دعوت تھی اس لئے ضرور تھا کہ اس اولین قربانی کا بھی وہ اسوۂ حسنہ قائم کرتے۔ پس آیۂ کریمہ مندرجہ صدر میں جب انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے خدا کو پکارا تو ارشاد ہوا کہ یہاں جسمانی رشتہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تمہارا بیٹا عملِ صالح کے اس نئے گھرانے میں داخل ہو جاتا جس کی تم نے بنیاد رکھی ہے تو وہ تمہارا عزیز تھا لیکن اس نے عملِ صالح کی جگہ عملِ غیر صالح سے رشتہ جوڑا پس اب اس کا ذکر بے کار ہے۔ اور یہ بناء قومیت کا وہ ناموسِ الٰہی ہے جس کا تمہیں علم ہونا چاہیئے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ۔ حضرت نوحؑ نے عرض کیا۔ اے میرے پروردگار! میں اپنے ضعفِ بشری کا اعتراف کرتا ہوں اور تیری رحمت و مغفرت میں پناہ لیتا ہوں۔ کہ جس چیز کی حکمت و حقیقت پر میری نظر نہ تھی میں نے اس کی نسبت تجھ سے سوال کیا۔"

پھر ارشاد ہے:۔

"حضرت نوح علیہ السلام نے جس نئی امت کی بنیاد رکھی چاہی تھی اگرچہ ضلالت عصر اور جہلِ انسانیت اس سے دست وگریباں رہی اور اس لئے مَا اٰمَنَ مَعَهٗ اِلَّا قَلِیْلٌ (۱۱-۱۶) ان پر ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی مگر ایک چھوٹی جماعت کو، تاہم جس امتِ صالحہ کی اس عہد اولی میں بنیاد پڑی تھی وہ ضائع نہ گئی۔ اور خدا کا کوئی حکم دعوت ضائع نہیں جا سکتا۔ اگرچہ خود حضرت نوح، پر بہت کم لوگ ایمان لائے۔ کیونکہ انسانی مدینۃ وعمران کا بالکل عہدِ طفولیت بلکہ اس سے بھی مقدم۔ دور تھا اور مذہب کا سلسلۂ ارتقاء ابھی ابھی اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا۔ لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے معتقدین و متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقاید واعمال بھی لے گئی۔

یہ دراصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوح، کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کر دینے کے لئے نہ تھی بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور اس کی بنیاد محض اخوۃ دینی پر قائم ہوتی ہے۔ بس وہ جغرافیہ و نسل سے ماوریٰ رہ کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے اور زمین کا ہر ٹکڑا نوعِ انسانی کا ہر حصہ۔ اقوام و ملل کی ہر نسل اس کے دامن میں پناہ لے سکتی ہے۔" (البلاغ ۱۲ ۱۱/۱۹۱۵)

یہ حقائق کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ خود انبیاء کرام علیہم السلام جس قومیت کی تاسیس کے لئے تشریف لاتے رہے۔ کیا وہ وہی قومیت ہے جو اشتراکِ وطن سے تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ اور مولانا صاحب جس کے آج اس فخر و مسرت سے لاینفک عنصر بننے کا اعلان فرماتے ہیں یا یہ وہ قومیت ہے جسے مشاہدہ کے لئے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت جاری رہا تھا۔

اب کوئی کفر کو اسلام کہنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج ؟

یہ الہلال کے مولانا آزاد تھے اور آج کے مولانا آزاد قومیت کا معیار وطن کی چار دیواری قرار دے رہے ہیں۔ الہلال والے ابوالکلام لکھتے ہیں:۔

"وہ انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتہ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لئے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لئے تھی قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی اور کہا کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۔

اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لئے کہ باہم پہچانے جاؤ۔ ورنہ دراصل یہ تفرق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں

امتیاز اور شرف اسی کیلئے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے " ومن ایاتہ اختلاف السنتکم والوانکم" لیکن وہ اس کو کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوتے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے۔ پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو۔ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ وَ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۔ (۲۳ : ۵۲) بے شک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں۔

اے برادرانِ ملت! یہی اسلام کی وہ عالمگیر اخوت اور دعوت اسلام کی وحدت تھی جس نے زمین کے دور دراز گوشوں کو ایک کر دیا تھا۔ اسلام نے ریگستان حجاز میں ظہور کیا مگر صحرائے افریقہ میں اس کی پکار بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبلِ ابو قبیس کی گھاٹیوں سے اٹھی مگر دیوارِ چین سے صدائے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کی بازگشت گونجی۔ تاریخ کی نظر میں جس وقت دجلہ و فرات کے کنارے پیروان اسلام کے نقش قدم گِن رہی تھیں عین اسی وقت گنگا اور جمنا کے کنارے سینکڑوں ہاتھ تھے جو خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے کے لئے وضو کر رہے تھے۔ وہ تمام دنیا کی مختلف قومیں، زمین کے دور دراز گوشوں پر بسنے والی آبادیاں گویا ایک ہی گھر کے عزیز تھے جن کو شیطانِ رجیم کی تفرقہ اندازیوں نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ لیکن خدائے رحیم نے ان صدیوں کے بچھڑے ہوئے دلوں کو ایک دائمی صلح کے ذریعے پھر ایک جگہ جمع کر دیا، اور ان کے روٹھے ہوئے دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے ملا دیا کہ تمام پچھلے شکوے اور شکایتیں بھول کر ایک دوسرے کے بھائی اور شریک رنج و راحت ہوگئے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۔ (۳ : ۹۸)

اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر نازل کی گئی جبکہ تم اسلام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر اسلام نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت پیدا کر دی، اور دشمن کی جگہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو گئے۔

یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا، بمجرد اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا، خواہ مصری ہو۔ خواہ الجیریا کا وحشی ہو، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے لڑکے سے روٹھ جائے۔ بعید نہیں کہ ایک ماں

اپنی گود سے بچے کو الگ کر دے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے تمام عہدِ مودت، خون اور نسل کے باندھے ہوئے پیمانِ وفا و محبت ٹوٹ جائیں مگر جو رشتہ ایک چینی کے مسلمان کو افریقہ کے مسلمان سے، ایک عرب کے بدو کو تاتار کے چرواہے سے اور ایک ہندوستان کے نومسلم کو مکہ معظمہ کے صحیح النسب قریشی سے ہم دست و یک جان کرتا ہے، دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اسے توڑ سکے اور اس زنجیر کو کاٹ سکے جس میں خدا کے ہاتھوں نے انسانوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لئے جکڑ دیا ہے۔" (الہلال - ۱۸ نومبر ۱۹۱۳ء)

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ہم چاہیں تو اس موضوع پر صفحات کے صفحات الہلال وغیرہ سے پیش کر سکتے ہیں لیکن عدمِ گنجائش زیادہ طوالت کی مانع ہے اس لئے اس عنوان پر مزید اقتباسات سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہوئی تو کبھی پھر سہی، انشاء اللہ۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے ہمارا شائع کردہ پمفلٹ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی" ملاحظہ فرمائیے۔ اس وقت ضمناً دو تین باتیں اشارۃً عرض کرنا ضروری ہیں۔ متحدہ قومیت سے مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے نظامِ جمہوری میں امورِ مہمہ کے فیصلے مسلم و غیر مسلم دونوں کی مشترکہ اکثریت سے نفاذ پذیر ہوں گے۔ مسلمانوں کی خالص جداگانہ اکثریت کا اس میں کوئی سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت معیارِ فیصلہ قوم کی اکثریت ہوگا نہ کہ مسلمانوں کی اکثریت۔ اس لئے کہ جب دونوں مل کر ایک قوم ہو گئے تو پھر ان کی الگ الگ ہستی کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ لیکن دیکھئے کہ الہلال والے مولانا آزاد اس باب میں کیا فرماتے تھے:

"اسلام میں حقِ امر و حکم کسی کو نہیں۔ وہ دنیوی انتظام و حکومت میں جب کسی ایک فرد کے استبداد کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ تو اس کے احکام دینیہ کیونکر تابع آراء اشخاص و جماعتِ مخصوصہ ہو سکتے ہیں! اس لئے یہ حق صرف قرآن کو دیا ہے یا پھر دنیوی امور میں اس اجماع کو جو تمام مسلمانوں کی اکثریتِ رائے سے عبارت ہے۔ (الہلال ۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ دینی امور میں فیصلے مسلمانوں کی اپنی اکثریت سے ہوں گے اور دنیاوی امور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قوم کی اکثریت سے۔ لیکن خود مولانا صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ دنیاوی امور میں بھی مسلمانوں کے فیصلے "وہ اجماع کر سکتا ہے جو تمام مسلمانوں کی اکثریتِ رائے سے عبارت ہے"۔ اس لئے کہ اسلام میں مذہب و سیاست، دین و دنیا کوئی الگ الگ شعبے نہیں ہیں۔ ان میں تو باہمی ایسا التزام و امتزاج ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ اب فرمائیے کہ مولانا صاحب کی "متحدہ قومیت" کی اکثریت کے فیصلے مسلمانوں کے نزدیک کس طرح قابلِ قبول ہو سکتے ہیں۔!

یہ ہیں وہ مولانا صاحب جن کا دعویٰ ہے کہ میں آج بھی الہلال کے مقام سے بول رہا ہوں۔ انہیں تو چاہیئے تھا کہ اپنے خطبۂ صدارت سے پہلے فرماتے کہ "ہم واردھا کے ریڈیو اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔ ابھی آپ کو مہاتما گاندھی کا ایک ریکارڈ سنایا جائے گا۔"

پھر مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا تصور "سرکاری دماغوں" کا پیدا کردہ ہے۔ قومیت پرست حضرات کا یہ ایک پرانا مرض ہے کہ جس کسی سے اختلاف ہوا جھٹ کہہ دیا کہ وہ گورنمنٹ کا آدمی ہے۔ سرکار پرست ہے۔ ٹوڈی ہے۔ دشمن آزادی ہے۔ اور اسے یوں نکو بنا کر اصل موضوع سے الگ ہو گئے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ اس باب میں مولانا صاحب بھی اسی بازاری سطح پر اتر آئے۔ اور جب اور کوئی دلیل نہیں سوجھی تو کہہ دیا کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا خیال سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے۔ صفحاتِ گزشتہ میں مولانا صاحب کی تحریروں کے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا تصور "سرکاری دماغوں" کا وضع کردہ ہے یا یہ تشکیل سرکارِ مدینہ رحمتِ دو عالمؐ، حضور رسولؐ کافۃ للناس پر نازل شدہ ضابطۂ خداوندی نے متعین فرمایا ہے۔ وہی چیز جو الہلال کے دور میں عین قرآنی تھی، اصل اسلام تھی، آج "سرکاری دماغوں کا وضع کردہ" بتائی جاتی ہے۔ ذرا سنئے کہ سرکاری دماغوں کا وضع کردہ "مسلمانوں کی جداگانہ قومیت" کا تصور ہے یا اس قومیت کا تصور جسے مولانا صاحب اشتراکِ وطن کے یورپی معیار کے مطابق اب متشکل فرما رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جغرافیائی حدود کی بنا پر تخلیقِ قومیت کا نظریہ یورپ کا پیدا کردہ ہے۔ اب دیکھئے کہ اس نظریہ کی طرف دعوت دینے والوں کے متعلق مولانا صاحب کا کیا ارشاد تھا۔ البلاغ جلد ۱ نمبر ۲ کے عربی افتتاحیہ میں مولانا صاحب نے جو کچھ لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

وہ اور فرنگیت کے خطیب پکار پکار کر چلا رہے ہیں کہ اگر زندگی چاہتے ہو تو مغربیت کی پیروی کرو تمہاری حیات رابطۂ اسلامی میں نہیں۔ اس لئے کہ مغربی تمدن کی نظروں میں رابطۂ اسلامی کچھ وقعت نہیں رکھتا اور مسلمانوں نے ازمنۂ گزشتہ میں جو قرآن کریم کی پیروی سے عزت و وقار حاصل کیا تھا تو وہ چیز اس زمانے میں کارآمد نہیں۔ اسے یورپین تمدن نے منسوخ کر دیا۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر شاد کام ہونا چاہتے ہو تو فرنگیت کو مضبوطی سے تھام لو اور قومیت پرستی کا زور شور سے اعلان کرو۔ اگر تم ایسا نہ رہو تو۔

لیکن یہ لوگ شیطان کے گروہ میں سے ہیں اور یاد رکھو شیطان کا گروہ ہمیشہ ناکام و نامراد رہے گا۔"

آج مولانا صاحب اشتراکِ وطن کی بنا پر قائم شدہ قومیت میں تمام مصائب کا حل بتاتے ہیں لیکن یہی مولانا صاحب اپنے اسلامی دور میں فرماتے تھے کہ

وہ ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی تو کوئی علیحدہ قومیت نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کے جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب، یا بالفاظِ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیں گے اس وقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہو سکے گی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ

کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے مسلمانوں کے لئے وہ اثر صرف "اسلام" یا خدا کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلہ میں اگر کوئی لفظ ہے تو "خدا یا اسلام" ہے۔"

اس وقت مسلمانوں کی روح کو گرمانے والے الفاظ "اسلام" اور "خدا" کے تھے۔ آج اس کے اندر حرارت پیدا کرنے کے لئے آشکدۂ وطنیت کا راستہ بتایا جا رہا ہے! اس وقت کہا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی کوئی قومیت زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق نہیں رکھتی اور آج انہی جغرافیائی تقسیم پر قائم شدہ قومیت کو قدرت کا فیصلہ بتایا جاتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا۔ جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اس قسم کی غیر اسلامی "متحدہ قومیت" کا اثر کیا ہوتا ہے؟ خود مولانا صاحب کے الفاظ میں سنیئے اپنے خطبۂ صدارت کے صفحات ۳۹-۳۸ پر ارشاد فرماتے ہیں۔

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں۔ مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے۔ مگر انہوں نے مل جل کر ایک سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں، جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے۔ تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے۔ اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں اُن لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (REVIVAL) مذہب میں ضرورت ہے، مگر معاشرت میں ترقی سے انکار کرنا ہے۔"

ذرا الفاظ کی سحر طرازی ملاحظہ فرمائیے۔ "ایران اور وسط ایشیا" لکھ کر مولانا صاحب نے نہایت سادگی لیکن ہُنر کاری سے ایک اہم اعتراض سے بچ نکلنے کی کوشش کی ہے۔ گویا انہوں نے ظاہر یہ کرنا چاہا ہے کہ وہ اس تہذیب و معاشرت کی تجدید کے خلاف ہیں جو مسلمان بحیثیت اپنے ساتھ لائے تھے یعنی اسلامی

تہذیب و معاشرت کے خلاف نہیں، لیکن مولانا صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ صرف "ایران و وسط ایشیا" کے دو لفظ لکھ دینے سے آپ اپنے دامنِ تقدس کو بچا کر نہیں نکل سکتے۔ ذرا ان الفاظ کے سیاق و سباق پر نگاہ ڈالیے اور سوچئے کہ آپ زبان۔ رسم و رواج۔ شعر و ادب۔ معاشرت۔ ذوق اور روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتوں کے متنوع گوشوں میں سے کسی ایک گوشہ کے لئے بھی اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمان یہ تمام کی تمام چیزیں وسطِ ایشیا اور ایران سے ہی اپنے ساتھ نہیں لائے تھے بلکہ ان کے تمدن و تہذیب کی آب و گل میں خلافِ پاک حجاز کا بھی کافی عنصر شامل ہے، اور مسلمان اپنی عجمی تہذیب کا احیاء نہیں بلکہ خالص اسلامی تہذیب کا احیاء چاہتے ہیں جس کی تلقین مولانا صاحب کبھی فرمایا کرتے تھے۔

"میرا عقیدہ ہے کہ آج حیاتِ ملت، حصولِ عظمتِ ملی کیلئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں بھی تماسیس کی ضرورت نہیں بلکہ صرف تجدید کی ضرورت ہے کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے اُن کو دوبارہ زندہ کریں اور جس متاع کو حاصل کر کے گم کر دیا ہے اس کے سراغ میں نکلیں۔ ہمارا جیب و دامن آج کی طرح ہمیشہ خالی نہ تھا۔ اگر آج اوروں کے پاس لعل و جواہر ہیں تو ہمارے پاس بھی اس کی کانیں تھیں۔ آج اگر ہم مفلس ہیں تو دوسروں کے لعل و جواہر کو نظرِ حسرت و طمع سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو اپنی گم کردہ کانوں کے سراغ میں نکلنا چاہیئے جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال تھی۔"

مولانا صاحب کا ارشاد ہے کہ ہندو اگر اپنی ہزار سالہ پیشتر کی تہذیب کا احیاء کرنا چاہتے ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ وہ خواب ہے جو کبھی پورا نہ ہوگا۔ گویا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ متحدہ قومیت میں ہندو بھی اپنی پرانی تہذیب کو از سرِ نو رائج نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ہر وہ شخص جس کی نگاہوں سے اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت سلب نہیں کر لیا۔ اچھی طرح سے دیکھ سکتا ہے کہ ہندو اپنی اس تہذیب کہنہ کا کتنا بڑا حصہ اس وقت تک ملک میں رائج کر چکے ہیں اور بقیہ کی ترویج و تنفیذ میں کس شدت سے کوشاں ہیں۔ کیا کانگرس کا اڑھائی سالہ دورِ حکومت محض اسی مقصد کے حصول میں صرف نہیں کیا گیا کہ کسی طرح پراچین کی پرانی تہذیب کا احیاء کیا جائے۔ اور مسلموں کو چھوڑ دیتے۔ ایک زبان ہی کو لیجئے۔ دیکھیے کہ اس دو تین سال کے عرصہ میں وہ کیا سے کیا ہو چکی ہے اور کیا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ خود "ابوالکلام بھی" "جناؤ" اور "سبھاؤ" جیسی پرتو نما زبان لکھ رہا ہے اور اس پر بھی مسلمانوں کو یہ کہہ کر دھوکا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ نہیں۔ فکر نہ کرو ہندو اپنی پرانی تہذیب کو رائج نہیں کر سکتے! دور کیوں جائیے۔ مولانا صاحب سے صرف اتنا پوچھیے کہ جس کانگرس سے آپ ابھی ابھی تشریف لا رہے ہیں وہاں آپ نے کیا منظر دیکھا! کہ اس میں پراچین تہذیب کی کوئی جھلک آپ کو نظر نہیں آتی تھی۔ جناب خود صدر سے "راشٹر پتی" بن چکے ہیں اور اس پر بھی آپ کو پراچین تہذیب کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

عشق کیونکر بتائے کیا ہے بلند ہے! اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے!

———(۰)———

اب حضرت مولانا صاحب کے خطبۂ صدارت کے مقطع کا بند بھی سنیئے۔ سنیئے اور سر پکڑ کر بیٹھ جائیے کہ یا اللہ! جب کوئی شخص تیرے پیامِ ابدی سے مذاق کرتا ہے تو اس کا کیا حشر ہو جاتا ہے! فرماتے ہیں اور وہی مولانا صاحب فرماتے ہیں جو ابھی ابھی اعلان فرما رہے تھے کہ "میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں کہ

"آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے۔

(۱) اتحاد

(۲) ڈسپلن۔ اور ——— اور (سنیئے سنیئے۔ ذرا کلیجہ تھام کر سنیئے)

"مہاتما گاندھی کی راہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا راہ نمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا۔ اور اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔" (ص ۳۶)

پھر سنیئے اِن الفاظ کو

"یہی ایک تنہا راہ نمائی ہے۔"

یہ مولانا صاحب کا ایمان ہے۔ اور قرآن کا ارشاد ہے کہ

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ۔ (۳/۷)

کہدو کہ راہنمائی صرف ایک ہے اور وہ راہ نمائی اللہ کی ہے۔

ایک انسان کی راہنمائی اور پھر انسانوں میں سے بھی ایک غیر مسلم کی راہ نمائی۔! استغفر اللہ ربی۔ سنیئے کہ دورِ اسلامیہ کے مولانا آزاد اس قسم کی راہ نمائی کے متعلق کیا فرماتے تھے۔ ارشاد ہے۔

"اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لئے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیرؤں کو پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا اُن کے آگے کھڑی ہو جائے گی۔ اُن کا خود اپنا راستہ موجود ہے، راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں۔ خدا ان کو سربلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں۔"

لیکن غیروں کے آگے سر اسی وقت جھکتے ہیں جب انہیں قبلۂ حاجات سمجھ لیا جائے جب انہیں "اَن داتا" قرار دے لیا جائے۔ اُف!

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کوتاہی کیا! یہاں تو بازو ہی ٹوٹ گئے۔

وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ۔ (۲۲/۳۱)

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ گویا وہ آسمان (کی بلندیوں) سے (زمین کی پستیوں پر) آگرا۔ اسے کوئی (پنجے دار، بڑا) پرندہ اچک کر لے گیا۔ یا ہوا کا (تیز جھونکا) اسے (پرکاہ کی طرح) کسی دور دراز مقام کی طرف اڑا کر لے گیا۔

مولانا صاحب کبھی فرماتے تھے۔

"البتہ بطور تحدیث نعمت کے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو یہ راہ سوجھائی کہ مسلمانوں کے پولیٹیکل نصب العین کو بھی قرآن کریم سے ماخوذ ہونا چاہیئے۔ ان کو اس راہ میں بھی از روئے مذہب قدم رکھنا چاہیئے۔ نہ کہ باتباع حریت جدیدہ یورپ و تقلید اخوان وطن۔ پھر یہ اس کا ایک فضل ہے اور اس میں گلے شکوے کی گنجائش نہیں۔ آج چالیس برس سے مسلمان پالیٹکس پر انکار یا اقرار کے لحاظ سے بحث کر رہے ہیں لیکن براہ کرم بتائیے کہ آج تک ایک صدا بھی تمام اسلامی ہند میں اس کی بلند ہوئی ہے؟ آج تک مسلمانوں نے اور ان کے تمام لیڈروں نے پولیٹیکل آزادی کو ہمیشہ ہندوؤں کی آرزو اور یورپ کے نئے آزادانہ دور کا نتیجہ سمجھا۔ لیکن کسی نے اس پہلو پر نظر نہ ڈالی کہ خود اسلام بھی مسلمانوں کو ان کی سیاست کے لئے کوئی بلند جگہ دیتا ہے یا نہیں۔ اس کا دعوےٰ کس کو ہے کہ نئی بات دکھلا دی۔ البتہ ایک کھوئی ہوئی بصارت تھی جو اب واپس آگئی ہے" (الہلال ۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۱۲ء)

لیکن افسوس کہ یہ بصارت مستقل طور پر مولانا کے پاس نہ رہی۔ آئی اور مولانا صاحب نے جاکر خدا کا دیا ہوا اسے قدموں میں ڈھیر کر دی اور خود اسکی لاٹھی پکڑ کر چلنا شروع کر دیا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۔ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ (۲/۱۶-۱۷)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی۔ لیکن ان کی تجارت انہیں کوئی نفع نہ دے گی۔ یونہی راہ راست کھو بیٹھے۔ ان کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص آگ جلاتے اور جب اس سے اس کا ماحول روشن ہو جائے تو اللہ اس کی روشنی سلب کر کے لے جائے اور وہ گھپ اندھیرے میں اندھوں کی طرح رہ جائے (کہ دوسروں کی لاٹھی کا سہارا ڈھونڈتا پھرے)۔

وہی کانگرس جن کی راہ نمائی پر اعتماد کی تلقین کی جا رہی ہے کبھی ان کے متعلق ارشاد تھا۔

"کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں، حقیقت حال کو جھٹلاتے ہیں۔ اصلیت کو چھپاتے ہیں۔ ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں۔ نقض امن کرتے ہیں اور پھر اس کو حفظ امن کا لباس پہناتے ہیں۔ قتل کرتے ہیں۔ اور اسے جاں بخشی دکھلاتے ہیں۔ بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پنچ میں (مجبور دیا کہ) کو کچھ اور جتاتے ہیں

ایسے لوگوں کی اطاعت منع ہے۔ ان کی فرماں برداری جرم ہے۔ گناہ ہے۔ موجب عذاب ہے۔ اس قلادے کو توڑ دینا چاہیئے۔ اس اطاعت سے تبری فرض ہے۔ اس فرمانبرداری پر نافرمانی کو ترجیح ہے۔ اُن کی تو خواہش ہے کہ مسلمان مداہنت کریں۔ خوشامد کریں۔ ریاکاری کریں۔ منافقت کریں تو انہیں بھی اظہار نفاق کا موقع ملے مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ صورت کس قدر خطرناک ہے؟ کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزت نفس و شرف کا انہیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں۔ حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں، مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کرتا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ اُن کے حلف پر نہ جانا۔ یہ ادھر کی بات ادھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منع خیر کے لئے نہایت مبالغے کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے۔ پاس عزت نہ رکھنے۔ ناموس کی نگہداشت ضروری نہ سمجھنے اور خاص خاص حالتوں میں رضامندی کے ساتھ حرامکاری تک کو قانوناً جائز قرار دینے کی وجہ سے اُن کی تو اصل تک محفوظ نہیں۔ یہ تو صریح بد اصل ہیں۔ بھلا ایسے لوگوں کی اطاعت کیونکر پسندیدہ ہو سکتی ہے؟ ان کو تو اپنے مال و اولاد کی فراوانی و کثرت یعنی فرط دولت و تکثیر آبادی کی وجہ سے اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے کہ آیات قرآنی کو پرانے ڈھکوسلے کہنے لگے ہیں۔" (الہلال۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۳ء)

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:۔

"کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنی چاہیئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔ جو ساز باز رکھتے ہیں۔ جنہیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہوگی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرت کاملہ کوئی اور انتظام کر دے گی۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ الآن قد ندمت ولا ینفع الندم۔ اس وقت تم نادم ہوئے جب ندامت مفید ہی نہ رہی۔" (مضامین آزاد حصہ سوم)

کہاں تک لکھتے چلے جایئے۔

سفینہ چاہیئے اس بحر بے کراں کے لئے

آنکھوں والے کے لئے اتنا ہی کیا کم ہے۔ وہ یہ کچھ دیکھ کر یقیناً متعجب ہوگا کہ بالآخر کیا بات ہے کہ مولانا صاحب یہ سب کچھ جانتے ہوئے آج گمراہی و ضلالت کے اس قدر عمیق گڑھوں میں جا گرے ہیں۔ اور اپنے ہی گرنے پر اکتفا نہیں، قوم کو بھی اسی جہنم کی طرف بلائے جا رہے ہیں۔ یقیناً یہ سوال فطری طور پر آپ کے دل میں پیدا ہونا چاہیئے۔ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، خود مولانا صاحب سے سنیئے۔ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے تو اس کی مقدم کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے سوچنے والے دماغوں اور دیکھنے والی آنکھوں کو قابو کرے۔ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ زمانہ

کی شہادات آپ کے روبرو ہیں۔ انہیں دیکھئے اور غور کیجئے کہ دنیا کس طرح اس "اصول" پر عمل پیرا ہوتی چلی آرہی ہے۔ یذبحون ابناءھم (بنی اسرائیل کے ابناء کا قتل) کچھ فرعونِ مصر کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا۔ دنیا میں ہر مستبد قوت اس قسم کے قتل کرتی چلی آتی ہے اور کر رہی ہے۔ فرق صرف آلاتِ قتل و ذرائع استعمال میں ہے۔ یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔ ہندو نے جب یہاں مسلمانوں کو غلام بنانے کی ٹھانی تو انہوں نے بھی سب سے پہلے اسی حربہ کو استعمال کیا اور مسلمانوں میں یذبحون ابناءھم شروع کر دیا۔ ملتِ اسلامیہ کے ہونہار سپوتوں میں سے کچھ ایسے تھے جو ہندوؤں کے دامِ فریب سے بچ کر نکل بھاگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ دنیا میں زنجیریں صرف لوہے کی نہیں ہوتیں اور چیزوں کی بھی ہوتی ہیں۔ سنیئے کہ مولانا صاحب اس باب میں کیا فرمایا کرتے تھے۔

وہ سالکِ راہ حریت و صداقت کے پاؤں میں اس کے دشمن لوہے کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ آئندہ کے منازل طے نہ کر سکے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ زنجیر لوہے کی جگہ سونے کی ہوتی ہے۔ وہ اس طلسمی زنجیر کو دیکھ کر راہ و رسمِ منزلِ صداقت پرستی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف دوڑ جاتا ہے اور مسکراتا ہوا خود دشمن کے ہاتھ سے لیکر اپنے پاؤں میں ڈال لیتا ہے۔ یہ طلسمی زنجیر کیا ہے؟ امیدِ زر اور طمعِ جاہ!

لیکن آہ! کس قدر دنی الوجود کم ظرف ہے وہ انسان جو صرف حبِ مال اور الفتِ زر کے لئے خدا کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے اور ایک فانی شئے کے لئے حق و صداقت کی باقی لازوال دولت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتا ہے وہ چاندی سونے کے سکوں کو اگر خدا کے لئے اور اسکی سچائی کے لئے کھو دے تو خدا اسے سچائی کے ساتھ واپس دلا سکتا ہے۔ پر جو خدا کی محبت کو دولت کے لئے کھوتا ہے وہ تو اسے دولت نہیں دلا سکتی۔ پھر انسانیت کے لئے کیسی دردانگیز موت ہے کہ انسان آسمان کی سب سے بڑی عزت کو زمین کی سب سے بڑی ذلت کے لئے کھو دے!

کتنے بڑے بڑے تاجدار۔ پرہیبت فاتح عظیم الشان سپہ سالار۔ نامور محبِ وطن اور محبوب القلوب ملت پرست انسان ہیں جن کی حق پرستانہ عزائم کی استقامت کو اسی لعنتِ طمع نے ڈگمگا دیا۔ انہوں نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنی فوج اور در اصل اپنے خدا اور اسکی صداقت سے غداری کی، اور دشمنوں کے لئے دوستوں کو، غیروں کے لئے اپنوں کو، ظالموں کے لئے مظلوموں کو، بے رحم فاتحوں کے لئے بیکس مفتوحوں کو، اور شیطان کے تخت کی زیب و زینت کے لئے خدائے رحمن کے دربارِ اجلال کی عزت و عظمت کو چھوڑ دیا! تاریخ کے صفحات ہمیشہ سے اسی درد کے ماتمی ہیں۔ قوموں اور ملکوں کی داستانیں ہمیشہ اسی ناپاک سرگزشت پر خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ اور دولت پرستی کی ملعون نسل آغازِ عالم سے ناصیۂ انسانیت کے لئے سب سے بڑا بے عزتی کا داغ رہی ہے۔ فی الحقیقت راہِ حق پرستی کی سب سے بڑی آزمائش چاندی کی چمک اور سونے کی سُرخی ہی ہے۔ اور اگر اس منزلِ پُرخطر سے تم گزر گئے تو پھر تمہاری ہمت بے پروا اور تمہارا عزم ہمیشہ کے لئے بے خوف ہے۔ یہی طمع کا خبیث دیو ہے جس کا پنجہ بڑا ہی زبردست اور جس کی پکڑ قلبِ انسانی کے لئے بڑی ہی مضبوط ہوتی ہے۔ اسی نے فرزندانِ ملت سے غیروں کے آگے مخبری کرائی ہے۔ یہی پکڑ پکڑ کے ابناءِ وطن کو لے گیا ہے اور غیروں کے قدموں پر اخلاق کی ناپاکی اور جذبات کی کثافت کے کیچڑ میں گرا دیا ہے تاکہ اپنے وطن، اپنی سرزمین

اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے بھائیوں کے خلاف جاسوسی کریں! اسی نے بڑے بڑے مدعیانِ خدمتِ ملک و ملت کی برسوں کی کمائی ایک آن کے اندر ضائع کر دی ہے اور انہیں چارپایوں کی طرح گرا دیا ہے تاکہ برسوں کی سچائی کو ایک لمحہ کی طمع پر قربان کر دیں۔ آہ! یہی انسانیت کے لئے وہ روحِ خبیثہ ہے جو بڑے بڑے پاک جسموں، بڑی بڑی مقدس صورتوں، بڑے بڑے پیرانِ علم و عمل دلوں کے اندر حلول کر گئی ہے اور فرشتہ سیرتوں نے شیطانوں کے، اور ملکوتی صفات ہستیوں نے خونخوار عفریتوں کے سے کام کئے ہیں۔" (مضامین آزاد)

آہ! ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہمارا قلب خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ رہا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ رہا ہے۔ ہاتھوں میں قلم کانپ رہا ہے کہ اے اللہ! جو تیری درگاہ سے دھتکار دیا جاتا ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے! اے مالک الملک صدقہ اپنی رؤف الرحیمی کا۔ غربت و افلاس، بھوک اور پیاس کی زندگی دے دینا لیکن طمعِ جاہ و ہوسِ زر کی نظر فریب افسونگرانہ کشش و جاذبیت سے بچائے رکھنا کہ جو اس سحر سے مسحور ہو گیا، ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گیا۔ اور جو تیرے در سے ٹھکرا دیا گیا اس کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ یوں تو لغزش ہر ایک کی خطرناک ہوتی ہے۔ لیکن ایک عالم کی لغزش تو وہ ہے جس کے متعلق خود نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ

"میں اپنی امت کے حق میں سب سے زیادہ جن باتوں سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہیں۔

(۱) عالم کی لغزش۔ (۲) منافق کا قرآن سے استدلال۔ (۳) اور گمراہ کرنیوالے سردار (لیڈر)

کہتے ہیں کہ حضرت امام اعظمؒ ایک دن بازار سے گزر رہے تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ اور راستہ میں کیچڑ تھی۔ ایک لڑکا ادھر سے گزرا تو آپ نے فرمایا کہ بیٹا! احتیاط سے چلو۔ قدم نہ پھسل جائے۔ گر جاؤ گے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اور آپ کو پہچان کر کہا کہ حضور! میرے گرنے کی فکر نہ کیجئے۔ اپنے آپ کو سنبھالئے۔ میں گرا تو خود ہی گروں گا اور اگر (خدا نکردہ) آپ گر گئے تو ساری دنیا گر جائے گی۔

کس قدر صحیح تھا اس بچے کا یہ تبصرہ۔ زید و بکر گمراہ ہوں تو ان کی گمراہی ان کی ذات تک محدود رہے گی۔ لیکن کوئی ابوالکلام آزاد "صحیح راستہ چھوڑ جائے تو پوری کی پوری قوم کو لے ڈوبے۔ ایک لیڈر کی یہی لغزش ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ (۱۴/۲۸)

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناسپاسی سے بدل دیا۔ اور اپنی قوم کو تباہی و بربادی کے جہنم میں لے گرے۔

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ قوم بر وقت متنبہ ہو گئی اور جہنم میں گرنے سے بچ گئی۔ اے کاش آج بھی اللہ تعالیٰ ان جہنم میں گرنے والوں کی چھنی ہوئی بصارت انہیں واپس دیدے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ فریبِ نفس نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے بشرطیکہ دلوں اور آنکھوں پر مہر ہی نہ لگ چکی ہو۔ وَمَن يُضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن مجید میں تحریف

(پرویز)

("احمدی" حضرات کی خصوصی توجہ کیلئے)

طلوع اسلام بابت جنوری ۱۹۶۲ء میں، عنوانِ بالا سے میرا ایک مختصر سا مقالہ شائع ہوا تھا جس میں میں نے (اختصاراً) کہا یہ تھا کہ قرآن کریم میں آیا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۔ (۲۲/۵۲)

(وحی کا سلسلہ ایسا رہا ہے کہ) کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں آیا جس (کے بعد اس) کی وحی میں دین کے دشمنوں (شیاطین) نے آمیزش نہ کر دی ہو۔ (جب ایسی آمیزش ہو جاتی تو خدا ایک اور رسول بھیج دیتا۔ اور اس کی طرف نازل کردہ وحی کے ذریعے) اس آمیزش شیطانی کو منسوخ کر کے خالص وحی کو پھر محکم کر دیتا تھا۔ یہ سب کچھ خدا کے علم و حکمت کی بنا پر ہوتا تھا۔

میرزا غلام احمد صاحب نے محدّث ہونے کا دعویٰ کیا، اور اس کی تائید میں کہا کہ،

آپ لوگ کیوں قرآن شریف میں غور نہیں کرتے اور کیوں سوچنے کے وقت غلطی کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ صاحبوں کو خبر نہیں کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس امت کے لئے بشارت دے چکے ہیں کہ اس امت میں بھی پہلی امتوں کی طرح محدّث پیدا ہوں گے اور محدّث، بہ فتح دال، وہ لوگ ہوں گے جن سے مکالمات و مخاطبات الٰہیہ ہوتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ابن عباس کی قرأت میں آیا ہے۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول و لانبي <u>ولا محدث</u> الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیۃ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن ثم یحکم اللہ ایٰتہ۔ پس اس آیت کی رو سے بھی جس کو بخاری نے بھی لکھا ہے

محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے جس میں دخل شیطانی قائم نہیں رہ سکتا۔

میرزا صاحب نے کہا ہے کہ اس آیت کی رو سے بھی (جس میں محدث کے لفظ کا اضافہ ہے) محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے۔

اس پر میں نے "احمدی" حضرات سے استفسار کیا تھا کہ کیا ان کے نزدیک منزل من اللہ آیت اس طرح ہے جس طرح ہمارے مروجہ قرآن کریم میں درج ہے (یعنی محدث کے لفظ کے بغیر) یا اس طرح جیسے (قرأت ابن عباس کی رُو سے) میرزا صاحب نے لکھا ہے (یعنی محدث کے لفظ کے اضافہ کے ساتھ) اور جب سے انہوں نے محدث کے الہام کے یقینی اور قطعی ہونے کی سند پیش کی ہے۔

اس کے جواب میں "احمدی" حضرات کی لاہوری شاخ کے ترجمان - پیغام صلح - بابت ۲۳ جنوری ۱۹۷۴ء نے مقالہ افتتاحیہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے دیکھ کر ہمیں افسوس ہوا کہ اگر ان حضرات کا مبلغ علم اتنا ہی ہے تو پھر اس مذہب کا خدا حافظ جس کے یہ مبلغ ہیں۔ اور اگر انہوں نے ایسا کچھ (دیدہ دانستہ) محض میرزا صاحب کی مدافعت کے لئے لکھا ہے تو یہ صورت حالات اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز ہے۔ "پیغام صلح" نے لکھا ہے کہ جسے "اختلاف قرأت" کہا جاتا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ ان (صحابہؓ) کی طرف منسوب قرآنی نسخوں (مصاحف) میں یہ آیات اس طرح درج تھیں، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرات ان آیات کا مفہوم یہ لیتے تھے۔ "پیغام صلح" کے الفاظ یہ ہیں:-

(۱) اس سے ظاہر ہے کہ ان نسخوں میں مندرج آیات کو آیات قرآنی قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ "اختلافِ قرأت" کہا گیا ہے۔ اور یہ اختلافِ قرأت کیا ہے؟ اس کو <u>آیات قرآنی کی تعبیر و تفسیر</u> ہی کہا جا سکتا ہے۔

(۲) قرأت ابن عباس سے مفہوم یہ ہے کہ اس قرأت کے مطابق محدث کے معنی بھی اس آیت سے نکل سکتے ہیں۔

(۳) میرزا صاحب نے اپنے دعوائے محدثیت کی تائید میں اسے قرآن کی آیت کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ صرف آیتِ قرآنی کا مفہوم قرار دیا ہے۔

عربی زبان کا ایک ابجد خواں بھی اس حقیقت سے واقف ہو گا کہ "قرأت" کے معنی "تفسیر و تعبیر" نہیں۔ اس کے معنی "پڑھنا" ہیں۔ جب "قرأتِ ابن عباس" کہا جائے گا تو اس سے مراد یہ ہو گی کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے، اور جس طرح وہ اس آیت کو پڑھا کرتے تھے اسی طرح یہ ان کے مصحف میں درج تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیری روایات الگ ہیں اور ان کی طرف منسوب کردہ مصحف (قرآنی نسخہ) الگ۔ ان کی تفسیر میں نہیں، بلکہ ان کی طرف منسوب کردہ مصحف میں زیر بحث آیت، لفظ محدث کے اضافہ کے ساتھ درج ہے۔ لہٰذا اسے "تفسیر" کہنا دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ "قرأت" کا لفظ، قرآن کریم میں (بصیغۂ فعل) اور کتب احادیث میں، "پڑھنے" کے معنوں میں آیا ہے۔ بخاری میں "مدّا لقرأت" ایک باب ہے جس میں "قرأت رسولؐ اللہ" کے تحت لکھا ہے کہ حضورؐ قرآن کریم

کو ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ کو صحیح کر کر پڑھا کرتے تھے۔ بخاری (کتاب فضائل قرآن) میں حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ایک روایت ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:-

میں نے ہشام بن حکیم (ابن حزام) کو رسول اللہ کی زندگی میں سورۃ فرقان پڑھتے سنا۔
"فاستمعت لقرأتہ" میں نے ان کا پڑھنا (قرأت) سنا تو وہ بہت سے ایسے
الفاظ پڑھ رہے تھے جو مجھے رسول اللہ نے نہیں پڑھائے تھے ......

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "قرأت" کے معنی "پڑھنا" ہیں۔ تفسیر یا مفہوم نہیں۔ ویسے بھی قرآنی آیت وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی .... کے متعلق کہنا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث..... قرآن کریم سے (معاذ اللہ) مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآن کریم نے "رسول اور نبی" کہا ہے۔ ان میں سے کون سا لفظ ہے جس کا مفہوم "محدث" ہے؟ اور اگر یہ تفسیر ہے تو پھر اضافہ کسے کہتے ہیں؟

آئیے آپ کو بتائیں کہ صاحب "کتاب المصاحف" (سجستانی) نے "اختلافِ قرأت" کا مفہوم کیا بتایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ فلاں صاحب کا مصحف، ہمارے مصحف سے مختلف ہے، تو اس اختلاف کی تین شکلیں ہوں گی۔

(۱) رسم الخط (کتابت) میں اختلاف

(۲) آیات میں الفاظ کے اضافہ کا اختلاف۔

(۳) آیات میں الفاظ کی کمی کا اختلاف۔ (کتاب المصاحف صفحہ ۳۰)

اس کے بعد جب وہ اختلافِ قرأت کی روایات درج کرتے ہیں تو ان میں اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں کہ فلاں راوی (یا راویوں) نے کہا ہے کہ سمعنا عمر ابن الخطاب یقرأ۔ ہم نے عمر ابن خطابؓ کو اس آیت کو یوں پڑھتے سنا.... یا و قال ھذا قرأت ابی ابن کعبؓ.... راوی نے کہا ہے کہ یہ ابی بن کعبؓ کی قرأت ہے (صفحہ ۵۳ تا ۵۹) ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اختلافِ قرأت سے کیا مراد ہے۔

رسم الخط کے اختلاف سے قطع نظر، اختلافِ قرأت کی دو شکلیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) آیات میں الفاظ کا اضافہ۔ (۲) الفاظ کی کمی۔ پہلے، الفاظ کی کمی کی دو چار مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) مروجہ نسخوں میں۔ فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج - (۲/۱۹۷)	مصحف عبداللہ ابن مسعودؓ میں فلا رفث ولا جدال فی الحج۔ (ولا فسوق کے الفاظ نہیں ہیں)۔
(۲) مروجہ نسخوں میں۔ قالا ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا (۷/۲۳)	مصحف ابن مسعودؓ میں قالا ربنا الا تغفرلنا و ترحمنا۔ (ظلمنا انفسنا کی کمی اور وان لم کی جگہ الا تغفرلنا۔)
(۳) مروجہ نسخوں میں۔ ومن الشیٰطین من یغوصون	مصحف ابن مسعودؓ میں۔ ومن الشیٰطین من یغوص لہ

لہٗ ویعملون عملاً دون ذالک وکنا لھم حٰفظین ۔ ویعمل وکنا لھم حٰفظین ۔ (الفاظ میں کمی اور اختلاف دونوں)
(۲۱ / ۸۲)

آیات میں الفاظ کے اضافہ کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تفسیر (یا توضیحِ مطلب) کے لئے لکھ دیئے گئے ہیں۔ لیکن جن آیات میں الفاظ کو حذف کر دیا گیا ہے، ان کے متعلق کیا کہیں گے؟ یا مثلاً، اس اختلاف کے متعلق کہ مروجہ قرآن مجید میں ہے و سخر لکم اللیل و النھار و الشمس والقمر و النجوم مسخرات بامرہٖ ۔ (۱۶ / ۱۲) اور مصحفِ ابن مسعودؓ میں ہے و سخر لکم اللیل و النھار والشمس والقمر والریاح بامرہٖ ۔ کیا الریاح (ہوائیں)، (النجوم (ستارے) کی تفسیر قرار پا سکتی ہے؟

"کمی" کے متعلق اتنا اور سن لیجیے کہ مصحفِ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ میں قرآن کریم کی تین سورتیں (سورۃ فاتحہ، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) تھیں ہی نہیں۔ (روایات میں ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ یہ سورتیں قرآن کا حصہ ہیں ہی نہیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ "اختلافِ قرأت" کا کیا مفہوم ہے؟ جہاں تک اضافہ کا تعلق ہے ہم اس کے لئے ایک مثال ہی کافی سمجھتے ہیں۔ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے سلسلہ میں، قرآن کریم (سورۃ النساء) میں، ان رشتوں کی تفصیل دینے کے بعد جن سے نکاح حرام ہے، کہا گیا ہے۔

وَ اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِیۡضَةً ... (۴ / ۲۴)

اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں۔ اس طرح کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ساتھ چاہو نکاح میں لا کر نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔ سو تم ان میں سے جس کسی سے نفع اٹھانا چاہو تو انہیں ان کے مقرر کردہ مہر دے دو۔ (ترجمہ مولانا محمد علی لاہوری)

سنیوں کے ہاں اس معاہدہ کا نام نکاح ہے جو مہر ادا کر کے، دائمی طور پر کیا جاتا ہے اور جو موت یا طلاق سے فسخ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس شیعہ حضرات متعہ کے قائل ہیں جس میں ایک مرد اور ایک عورت، ایک مدتِ معینہ کے لئے، مباشرت کا معاملہ طے کر لیتے ہیں اور اس کے لئے اس عورت کو جنسی تعلق کا معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ سنیوں کے ہاں متعہ حرام ہے۔

اس تمہید کے بعد آگے بڑھیے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سنیوں کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کی قرأت (مصحف) میں مندرجہ بالا آیت یوں آئی ہے۔

فاستمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی ......

تم ان سے ایک مدتِ معینہ کے لئے فائدہ اٹھاؤ۔

یعنی اس قرأت کی رو سے آیتِ قرآنی میں "الی اجل مسمی" کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے متعہ کی سند مل جاتی ہے۔ اب دیکھیے کہ اس اضافہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کیا فرماتے ہیں۔ سنیوں کی

سب سے پہلی، اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تفسیر، تفسیر طبری ہے۔ وہ اس آیت (۴/۲۴) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ابونضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباس رضؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۃ النساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ کہا، پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمیٰ میں نے کہا۔ نہیں میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اصلی آیت یونہی ہے۔ عبدالاعلیٰ کی روایت میں بھی ابونضرہ سے اسی طرح کا واقعہ منقول ہے۔ تیسری روایت میں بھی ابونضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباس رضؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی فما استمتعتم به منهن۔ ابن عباس رضؓ نے کہا۔ الی اجل مسمیٰ۔ میں نے کہا میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا "خدا کی قسم! خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے۔"

ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب بھی یہ بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے یا نہیں کہ "اختلافِ قرأت" سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کے بعد بھی آپ فرمائیں گے کہ اختلافِ قرأت سے مراد تفسیر اور مفہوم کا اختلاف ہے؟ حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم۔ خدا نے اس آیت کو نازل ہی اس طرح کیا تھا۔ جس طرح میں پڑھتا ہوں نہ کہ اس طرح جس طرح یہ مصحفِ عثمانی میں درج ہے!

(۱)

آیئے۔ اب آپ کو یہ بتائیں کہ یہ تصور کہاں سے آیا ہے کہ "اصل میں تو یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی لیکن مروجہ قرآن میں یہ اس طرح درج ہے۔"

شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن مسلمانوں میں مروج ہے وہ محرف ہے۔ اس میں اکثر و بیشتر آیات اُس طرح نہیں لکھی گئیں جس طرح وہ نازل ہوئی تھیں۔ ان میں تحریف کر دی گئی ہے۔ اصلی آیات کا علم ان کے ائمہ کرام کو ہے۔ الکافی شیعہ حضرات کی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد احادیث کی کتاب ہے۔ یہی ان کے مسلک کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ اس میں متعدد آیات کے متعلق لکھا ہے کہ یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی تھی لیکن مروجہ قرآن میں اس طرح درج ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

عن جابر عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال قلت لہ لم سمی امیر المومنین۔ قال اللہ سماہ۔ و ھکذا انزل فی کتابہ۔ و اذ اخذ ربک من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم و اشھدھم علی انفسھم الست بربکم۔ و ان محمد رسول اللہ و ان علیاً امیر المومنین۔ (۷/۱۷۲)

جابر نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ حضرت علی رضؓ کا نام امیر المومنین کیوں ہوا۔ فرمایا۔ کتابِ خدا میں یوں نازل ہوا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

(کتاب الشافی، ترجمہ الکافی۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۵۰۶)

قرآن کریم (مروجہ نسخوں) میں اس آیت (۷/۱۴۲) میں "وان محمد رسول اللہ وان علیاً امیر المومنین" کے الفاظ نہیں۔ لیکن الکافی میں ہے کہ یہ آیت دراصل اس طرح نازل ہوئی تھی جس طرح الکافی میں درج ہے۔ یا مثلاً۔

عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قولہ تعالٰی و من یطع اللہ و رسولہ فی ولایۃ علی و ولایۃ الائمۃ من بعدہ فقد فاز فوزا عظیما۔ ھکذا نزلت۔

ابو بصیر سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیہ من یطع اللہ و رسولہٗ کے متعلق فرمایا ...... (اس کے بعد آیت درج ہے) کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی تھی۔

(کتاب الشافی۔ جلد اول ص۵)

قرآن کریم کے مروجہ نسخوں میں آیت (۳۳/۴) میں یہ الفاظ نہیں ہیں "فی ولایۃ علی و ولایۃ الائمۃ من بعدہ"۔ لیکن الکافی کا بیان ہے کہ یہ آیت دراصل ان الفاظ کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔ لیکن مصحفِ عثمانی میں ان الفاظ کو حذف کر دیا گیا ہے۔

غرضیکہ الکافی میں متعدد آیات ایسی درج ہیں جو مروجہ قرآنی نسخہ سے مختلف ہیں اور جن کے متعلق کہا گیا کہ "ھکذا نزلت" یہ اسی طرح نازل ہوئی تھیں۔ اسی کو وہ "قراءتِ اہلِ بیت" کہتے ہیں۔

شیعہ حضرات نے یہ کہا تو سنیوں نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ یہ روایات شیعہ حضرات کی ہیں جو ہمارے نزدیک وضعی ہیں۔ ہم ان کی سند تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ خود سنیوں کی کتب روایات میں بے شمار آیات ایسی آ گئیں جو مروجہ نسخۂ قرآن مجید سے مختلف ہیں۔ انہیں "اختلافِ قراءت" کہا جاتا ہے۔ ان کے متعلق وہ صحابہؓ جن کی طرف یہ روایات منسوب ہیں، فرماتے ہیں (جیسا کہ ہم حضرت ابن عباسؓ کے متعلق دیکھ چکے ہیں) کہ یہ آیات دراصل نازل اسی طرح ہوئی تھیں۔ یعنی وہی بات جو شیعہ حضرات کی روایات میں تھی۔ اس کے بعد سنیوں کے پاس شیعہ حضرات کی مخالفت کے لئے کوئی دلیل نہ رہی اور شیعہ اور سنی دونوں کی کتب روایات کی رو سے ثابت ہو گیا کہ موجودہ قرآن مجید (معاذ اللہ) محرّف ہے۔

لیکن سنی حضرات ہیں کہ ہزار برس سے شیعہ حضرات سے جھگڑتے چلے آ رہے ہیں۔ کہ آپ لوگ قرآن کو محرّف کہتے ہیں حالانکہ قرآن غیر محرّف، غیر متبدل، کتاب خداوندی ہے، اور اس کے ساتھ ہی "اختلافِ قراءت" کی روایات کو بھی صحیح مانتے چلے آتے ہیں، اور اتنا نہیں سوچتے کہ ان روایات کو صحیح مان کر، تحریف فی القرآن کا ثبوت آپ خود ہم پہنچا رہے ہیں۔

اب آیئے، عقیدہ، محدّثیت کی طرف۔ اور اسے غور سے پڑھیئے۔

الکافی کی "کتاب الحجۃ" کے ایک باب کا عنوان ہے۔

نبی و رسول و محدث کا فرق۔

اس کے نیچے سب سے پہلی روایت یہ درج ہے

زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے آیہ کان رسولاً نبیاً کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے۔ فرمایا نبی وہ ہے جو فرشتہ کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اس کی آواز سنتا ہے۔ لیکن ظاہر بظاہر حالتِ بیداری میں نہیں دیکھتا اور رسول وہ ہے جو آواز بھی سنتا ہے۔ خواب میں بھی دیکھتا ہے اور ظاہر میں بھی۔ میں نے پوچھا۔ امام کی منزلت کیا ہے۔ فرمایا فرشتہ کی آواز سنتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی۔

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبي ولا محدث ....

(کتاب الشافی۔ جلد اول صفحہ ۲۰۳)

عربی (الکافی) میں "ولا محدث" کے نیچے (حاشیہ میں) لکھا ہے۔

انما هو في قرأة اهل البيت عليهم السلام۔ (جلد اول صفحہ ۱۷۶)

قرأت اہل بیت میں اسی طرح آیا ہے۔

الکافی میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علی رضؓ نے فرمایا تھا کہ میں اور میرے صلب میں گیارہ امام محدث ہیں۔

(الشافی جلد اول صفحہ ۲۰۸)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ محدث کے عقیدہ کا سرچشمہ (ORIGIN) کیا ہے، اور قرأت کا مفہوم کیا ہے؟ لیکن یہ روایت شیعہ حضرات کی ہے جو سنیوں کے نزدیک سند قرار نہیں پا سکتی تھی اس لئے سنیوں کے ہاں یہی روایت، "قرأت ابن عباسؓ" کے لباس میں آگئی۔ چنانچہ مصحفِ حضرت ابن عباسؓ میں یہ آیت اسی طرح درج ہے۔ یعنی۔

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبي ولا محدث۔ (۲۲ ۵۲)

اور اسی کو میرزا صاحب۔۔ اپنے دعوائے محدثیت کی تائید میں پیش فرماتے ہیں، اور "پیغام صلح" اسے تغیر قرار دیتا ہے۔

———— (۰) ————

حقیقت یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم جس طرح خدا کی طرف سے حضورؐ پر نازل ہوا، حضورؐ نے اسے محفوظ و مرتب شکل میں امت کو دے دیا۔ یہ مصحف، حضورؐ کی زندگی میں لکھا ہوا مرتب شکل میں بھی موجود تھا، اور ہزاروں لاکھوں حفاظ کے سینے میں بھی محفوظ۔

(۲) قرآن کریم کا یہی نسخہ صحابہ کرامؓ کے پاس تھا۔ اسی کی نقول عہدِ خلافتِ راشدہ میں مختلف ممالک میں بھیجی گئیں۔ یہی قرآن امت کے پاس محفوظ شکل میں اب تک چلا آرہا ہے۔

(۳) کسی کے پاس نہ کوئی اور نسخہ تھا اور نہ کوئی اس بات کا مدعی یا قائل کہ اس کے پاس کچھ آیات ایسی ہیں جو مروجہ قرآن میں اور طرح درج ہیں۔

اس قسم کی تمام روایات جن میں کہا گیا ہے کہ — (۱) حضورؐ قرآن کو غیر مرتب شکل میں چھوڑ گئے تھے۔ (۲) اسے بعد میں صحابہؓ نے مرتب کیا۔ (۳) مختلف صحابہؓ بعض آیات کو کسی اور طرح پڑھتے تھے۔ یا (۴) ان کے پاس مختلف مصاحف تھے — سب وضعی ہیں اور قرآن کریم کو محرف ثابت کرنے کی سازش۔

ہمارے علماء ان وضعی روایات کو صحیح مانتے ہیں کہ انہیں اسلاف کی تقلید میں ایسا کرنا پڑتا ہے، لیکن آپ غور کیجئے کہ ایک صاحب (میرزا غلام احمد صاحب) نبی، رسول، یا کم از کم 'مامور من اللہ'، مجدد، محدث، ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ایک ایسی روایت کو اپنے دعوے کی تائید میں پیش کرتے ہیں جو بالبداہت وضعی ہے۔ یہ صورت دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو مرزا صاحب کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ محدث کے نظریہ کا سرچشمہ کون سا ہے، اور کس طرح یہ شیعی عقیدہ، وضعی روایات کے راستے سنیوں کے ہاں پہنچ گیا۔ اور یا انہوں نے عام مسلمانوں کے تقلیدی عقیدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دانستہ ایسا کیا۔ دونوں صورتوں میں جو نتیجہ سامنے آتا ہے، ظاہر ہے۔

اس کے بعد میرا سوال جو میرے مقالہ (شائع شدہ جنوری ۱۹۷۴ء) میں اٹھایا گیا تھا، بدستور قائم رہتا ہے۔ یعنی

(۱) میرزا صاحب نے کہا ہے کہ ابن عباسؓ کی قرأت میں آیت (۲۲/۵۲) لفظ "محدث" کے اضافہ کے ساتھ آئی ہے۔

(۲) طبری کی تفسیر سے واضح ہے کہ خود حضرت ابن عباسؓ نے اس امر کی تشریح کر دی تھی کہ ان کی "قرأت" سے مراد یہ ہے کہ متعلقہ آیات در اصل یوں نازل ہوئی تھیں۔

(۳) اس سے واضح ہے کہ خود مرزا صاحب یہ مانتے تھے کہ یہ آیت لفظ محدث کے اضافہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی اور مروجہ نسخہ قرآن میں اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ لہذا وہ قرآن میں تحریف کے قائل تھے۔ یہ کہہ کر ان کی مدافعت کرنا کہ اختلاف قرأت سے مراد تفسیر و تعبیر ہے، خود فریبی ہے یا مغالطہ آفرینی کی ناکام کوشش۔

———— (○) ————

"پیغام صلح" نے مرزا صاحب کے غلط مسلک کی مدافعت میں جس طرح پیچ و تاب کھائے ہیں، اس قسم کے واقعات سے یہ حقیقت اور بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ختم نبوت کا اعلان کس طرح خدا کی رحمت تھی۔ اس عقیدہ کا عملی مفہوم یہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کے بعد کوئی شخصیت ایسی نہیں ہو سکتی جسے ہم منزہ عن الخطاء سمجھنے کے لئے مکلف ہوں۔ ختم نبوت پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک میرزا صاحب ایک عام انسان تھے۔ اس لئے ان کی فکر میں اسقام اور پیش کردہ میں غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب انہیں مامور من اللہ، ملہم ربانی تسلیم کر لیا جائے تو پھر انہیں منزہ عن الخطا ماننا پڑتا ہے اور ایسا ماننے والوں

پر، ہر معاملہ میں ان کی مدافعت عقیدۃً ضروری قرار پاجاتی ہے۔ اب سوچئے کہ جس شخص کو کسی کی ناقابلِ مدافعت (غلط) بات کی مدافعت کرنی پڑے تو (اگر اسے اپنی اس مجبوری کا احساس ہے تو) وہ کس قدر ذہنی کوفت اور قلبی اذیت میں مبتلا رہیگا۔ اور اگر (شدتِ عقیدت کی بنا پر) اسے اس کا احساس ہی نہیں، تو اس سے کس قدر مضحکہ انگیز حرکات سرزد ہوں گی۔ یہی کیفیت میرزا صاحب کے اغلاط و اسقام کی مدافعت میں ان کے متبعین کی ہوتی ہے، جیسا کہ زیرِ نظر بحث سے واضح ہے۔

(٠)

ضمناً: "پیغام صلح" نے آخر میں لکھا ہے۔

یہ پرویز کی کم ظرفی کا ایک اور ثبوت ہے کہ وہ اپنی کوئی تصنیف جس میں حضرت مرزا صاحب یا جماعت احمدیہ کا ذکر ہو، ہمیں بھیجنا، یا کم از کم اس سے مطلع کرنا گوارا نہیں کرتے جس سے جماعتِ احمدیہ کے دلائل سے ان کا مرعوب ہونا ثابت ہے[1]۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

میں اس کا نوٹس نہ لیتا۔ لیکن ان حضرات کا شکریہ لازم ہے کہ انہوں نے "کم ظرف" کہنے پر ہی اکتفا کیا ہے ورنہ میرزا صاحب تو اپنے معترضین کے خلاف دشنام طرازیوں میں بہت دور تک چلے جایا کرتے تھے۔

(٭)

---

[1] دفتر طلوع اسلام نے بتایا ہے کہ انہوں نے میری ہدایت کے مطابق 'طلوع اسلام' کا وہ پرچہ جس میں میرا مقالہ شائع ہوا تھا، "پیغام صلح" اور "الفضل" کے نام بصیغہ رجسٹری بھیجدیا تھا۔ الفضل نے اگر اس کے جواب میں کچھ لکھا ہے تو وہ میرے علم میں نہیں آیا۔

اعلان

اندرون کی ڈاک میں بسا اوقات ایسے منی آرڈر آتے رہتے ہیں جن میں بھیجنے والے کا پورا پتہ لکھا ہوا نہیں ہوتا، یا یہ وضاحت نہیں کی ہوتی کہ منی آرڈر کس مقصد کے لئے ارسال کیا گیا ہے۔ مثلاً کیا ترسیل کتب یا نئی خریداری رسالہ یا محض تجدید خریداری یا پیشگی کھاتہ وغیرہ کے لئے ہے۔

نامکمل کوائف کی صورت میں ان رقوم کی وصولی کے بعد ان کے اندراج میں بھی کافی دقت پیش آتی ہے اور تعمیل فرمائش میں بھی۔

اندریں حالات گزارش ہے کہ منی آرڈر ارسال کرتے وقت اس کے کوپن پر اپنا پورا پتہ اور جس مد میں روپیہ بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی وضاحت کر دیا کریں۔

(ناظم)

شاہد عادل
میانوالی

جہادِ کشمیر کی حُرمت کا فتویٰ

تاریخ کا ایک المیہ

گزشتہ سال کے شروع میں مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن پر راقم کا مبسوط تبصرہ ماہ نامہ طلوع اسلام میں قسط وار شائع ہو رہا تھا۔ اس کے دوران راقم نے دوسری جلد کے تبصرے میں ایک نازک مسئلہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہ نازک مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں سے شادی بیاہ کے بارے میں تھا جسے مودودی صاحب نے اپنی قرآنی فکر کی روشنی میں ناجائز قرار دے دیا تھا۔ مودودی صاحب کے اس فتویٰ کا تجزیہ کرتے ہوئے راقم نے یہ ثابت کیا تھا کہ دراصل مودودی صاحب جہاد کشمیر کی حرمت کے بارے میں جو غلط فتوے دے چکے ہیں اس کی کوئی شرعی بنیاد نہیں تھی۔ اس کے لئے انہوں نے قرآن مجید کی ایک آیت کی ایسی تاویل و تفسیر فرمائی جس کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں سے شادی بیاہ حرام قرار پاتا تھا۔

میرے اس تجزیئے کو پڑھنے کے بعد کراچی سے ایک عزیز نے خط لکھا جس میں مجھ پر غلط بیانی کا الزام لگایا گیا۔ ان کا ارشاد تھا کہ مودودی صاحب نے جہاد کشمیر کو کبھی حرام قرار نہیں دیا تھا۔ یہ تو اس وقت کے حکمرانوں نے ان کی کردارکشی کے لئے ان کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کراچی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "پیمان" کا ۹ ارمارچ ۱۹۷۳ء کا شمارہ بھی ارسال کیا جس میں مودودی صاحب کا باتصویر انٹرویو تھا اور اس کا عنوان تھا "ایک سرکاری ملازم نے اخباروں کو جھوٹا بیان دیا کہ میں (مودودی) نے جہادِ کشمیر کو حرام قرار دیا ہے"۔ راقم نے اس ہفت روزہ کا مطالعہ شروع ہی کیا تھا کہ چند احباب تشریف لائے اور اس رسالے کے ٹائیٹل پر ایک دلکش تصویر دیکھ کر بڑی منت سماجت سے وہ شمارہ لے گئے۔ یہ تصویر کراچی یونیورسٹی یونین کے انتخابات کے بارے میں تھی جس میں اسلامی جمعیۃ طلبہ سے متعلق تین لڑکیاں بڑی شانِ بے نیازی سے کھڑی تھیں۔ اور ان کے کھلے بالوں پر دوپٹوں کی بجائے جو کاغذی تاج سجے تھے ان پر اسلامی جمعیۃ طلبہ تحریر تھا۔ اندر کے صفحات میں جمعیت کی طرف سے جیتنے والی ایک محترمہ رخسانہ ریاض کا انٹرویو تھا جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ہم تعلیم یافتہ لڑکیوں کے گھر میں قید رہ جانے کو پسند نہیں کرتے۔ (صـ ۲۳) راقم کے لئے تو ان میں سے کوئی چیز بھی انوکھی یا غیر معمولی نہ تھی لیکن میانوالی جیسے قدامت پسند علاقے کے لئے اس میں انوکھے پن سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ بالخصوص جب کہ اس میں مودودی صاحب کے فوٹوؤں کے مختلف پوز تھے حالانکہ آپ شرعی طور پر ہر قسم کے تصویر کشی کو حرام قرار دیتے ہیں اور

عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکالنے والے "ملزموں" کو اپنی تفسیر جیسی متبرک کتاب میں شیطان کے شاگرد قرار دیتے ہیں (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۹۹) مختصر یہ کہ یہ اخبار ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ میں جانے لگا۔ یہاں تک کہ راقم اس سے محروم ہو گیا۔

لیکن یہ محرومی بھی راقم کے حق میں نوازش ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد کراچی کے ایک دوست کے تعاون سے مجھے "پیمان" کے وہ سات شمارے مل گئے جن میں مودودی صاحب کا انٹرویو قسط وار پھیلا ہوا تھا۔ اس انٹرویو کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اسے پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم باب قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خود مودودی صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ یہ واقعات پہلی مرتبہ منظر عام پر آ رہے ہیں (صفحہ ۷) اس انٹرویو میں پاکستان کی سیاسی تاریخ کے بہت سے اہم معاملات کے بارے میں کچھ ایسے دعوے کئے گئے ہیں جن کی صحت بڑی حد تک مشکوک ہے ممکن ہے یہ مبسوط انٹرویو اس وقت تک کتابچے کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہو، جو آئندہ کے لئے ہماری مستند "تاریخ" بن جائے بنا بریں راقم اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہے کہ ان مشکوک دعوؤں کی اصل حقیقت قارئین کے سامنے پیش کر دے۔ اس مقصد کے لئے ہم سب سے پہلے مودودی صاحب کے اس دعویٰ کو لیتے ہیں جو ان کے پہلے انٹرویو کا عنوان ہے۔ یعنی ایک سرکاری ملازم نے اخباروں کو یہ جھوٹا بیان دیا کہ میں نے جہاد کشمیر کو حرام قرار دے دیا ہے چنانچہ اس الزام کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے اس انٹرویو میں فرماتے ہیں۔

فتویٰ سے انکار

میں پہلے بھی کئی مرتبہ یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ میں نے اس قسم کا کوئی فتویٰ کبھی نہیں دیا۔ بات صرف یہ ہوئی تھی کہ حکومت آزاد کشمیر کا پبلسٹی سیکرٹری ایک دن پشاور میں میرے پاس آیا۔ اور اس نے مجھ سے تخلیے میں کچھ بات کرنے کی اجازت چاہی۔ میں نے اسے تنہائی فراہم کی تو اس نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ آخر جہاد کشمیر میں حصہ کیوں نہیں لے رہے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کی وجہ دانستہ بیان کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہا کہ اگر مجھے جہاد کشمیر میں حصہ نہ لینے کی وجہ بیان کرنی ہوتی تو میں یہ کام خود کرتا۔ اس کے لئے مجھے آپ کی مدد لینے کی کیا ضرورت تھی کہ میں آپ سے بیان کروں اور آپ اسے دنیا کے سامنے بیان کریں۔ وہ بولا میں یہ بات محض اپنے اطمینان کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ میرا مقصد اس معاملے کی ترویج و اشاعت نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ واقعی یہ بات صرف اپنے اطمینان کے لئے پوچھ رہے ہیں تو سنیئے۔ جہاد کشمیر کے سلسلے میں میرے نزدیک یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ وہاں لڑائی بھی ہو اور نہ بھی ہو۔ یعنی ایک طرف ہماری حکومت تمام دنیا کے سامنے اعلان کرے کہ ہم لڑ نہیں رہے بلکہ لڑنے والوں کو روک رہے ہیں اور دوسری طرف وہ لڑے بھی، تو اس سے نہ صرف ہماری اخلاقی پوزیشن خراب ہو گی بلکہ ہم لڑ بھی نہیں سکیں گے۔" (صفحہ ۷)

مودودی صاحب نے جہاد کشمیر میں "جو کچھ" فرمایا تھا اگر وہ محض زبانی کلامی ہوتا تو پھر تو ان کی مذکورہ بالا وضاحت واقعی پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک باب بن جاتی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ انہوں نے اس بارے میں جو کچھ

فرمایا تھا وہ سب تحریر میں آچکا تھا، جس میں اور تو بہت کچھ تھا لیکن مذکورہ بالا وضاحت کے الفاظ نہیں تھے۔ جو حکومت کے پبلسٹی سیکرٹری سے آپ نے جو "بھی گفتگو فرمائی تھی، "احتیاط" کے لئے آپ نے "اس کی ایک نقل رکھ لی تھی جو بعد میں جماعتِ اسلامی کے اس وقت کے ترجمان "سہ روزہ کوثر" میں شائع کی گئی تھی۔ بڑے لیڈروں کی ان باتوں کو شاید بچی تصور کر لیا جائے جو وہ اپنے بیوی بچوں سے کریں۔ وگرنہ ان کے معتبر سے معتبر دوست اور رفیقِ کار سے گفتگو کو بھی کبھی بچی نہیں سمجھا گیا، بالخصوص جب یہ نجی گفتگو ایک ایسی حکومت کے اہم عہدیدار سے ہو جسے مودودی صاحب اٹھتے بیٹھتے مثیلِ فرعون قرار دیتے ہوں۔ (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۶۳)

جہادِ کشمیر کے بارے میں سہ روزہ کوثر میں چھپنے والے مودودی صاحب کے طویل بیان کو نقل کیا جائے

فتویٰ نہیں فقہی رائے

تو بات لمبی ہو جائے گی۔ بغرضِ اختصار ہم جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کی اس بارے میں قرارداد کا وہ حصہ نقل کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی کہ مودودی صاحب نے جہادِ کشمیر کی حرمت کے بارے میں "کیا کچھ" فرمایا تھا۔ آپ نے اس بارے میں "جو کچھ" فرمایا تھا علمائے پاکستان اور عامۃ الناس نے اسے ایک فتوےٰ سمجھا۔ لیکن مودودی صاحب بار بار اصرار فرماتے رہتے کہ یہ فتویٰ نہیں، کچھ اور تھا۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے سب سے پہلے اس دلدل سے نکلنے کے لئے یہ وضاحت فرمائی۔

"یہ کوئی فتوےٰ نہیں تھا بلکہ امیر جماعتِ اسلامی کی فقہی رائے تھی۔"

(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۴۸ء صفحہ ۳۲۸)

جماعتِ اسلامی کی مجلس شوریٰ اگر فتوےٰ اور فقہی رائے میں فرق بیان کر دیتی تو اہلِ پاکستان پر اس کا احسان ہوتا۔ لیکن معلوم نہیں اس نے یہ تکلیف گوارا کیوں نہ کی کہ عامۃ الناس تو کجا پاکستان کے بڑے بڑے علمائے دین تک اسے فتویٰ ہی سمجھتے رہے۔

جان چھڑانے کی کوشش

چنانچہ یہ فتوےٰ تھا یا "فقہی رائے" جماعت اسلامی کے لئے ایک مصیبت بن چکا تھا۔ اس سے جان چھڑانے کے لئے مجلسِ شوریٰ نے یہ قرارداد منظور کی۔

> امیر جماعت نے اپنے پچھلے بیانات میں جو شرعی مسئلہ بیان کیا تھا وہ اس حالت سے متعلق تھا جبکہ سرکاری طور پر اس امر کا اقرار و اظہار نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی فوجیں حدودِ کشمیر میں موجود ہیں۔ اب ۷ ستمبر کو مجلسِ اقوامِ متحدہ کے کشمیر کمشن سے حکومتِ پاکستان کی جو مراسلت شائع ہوئی ہے اور وزیرِ خارجہ پاکستان نے ۸ ستمبر کو جو بیان دیا ہے اس میں اس امرِ واقعہ کا اظہار و اقرار موجود ہے اور حکومتِ ہند بھی اس پر مطلع ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب چونکہ معاملہ کی نوعیت بدل گئی ہے اور اس بنا پر اس کا شرعی حکم بھی وہ نہیں ہوگا جو پہلے تھا۔ اس لئے مجلسِ شوریٰ کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اب معاہدانہ تعلقات کے باوجود اہلِ پاکستان کے لئے جہادِ کشمیر میں جنگی حصہ بالکل جائز ہے۔ (ایضاً)

دیکھیے مجلس شوریٰ کی اس تاویل کی چلمن سے جہادِ کشمیر کی حرمت کا اصل فتویٰ کس بُری طرح جھانک رہا ہے۔۔۔ "اب" بالکل جائز ہے کے الفاظ پر غور فرمایئے جس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ پہلے یہ بالکل ناجائز تھا، اور شاید ناجائز کے لئے کبھی کبھی حرام کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

مدیر نوائے وقت حمید نظامی مرحوم کی طنز

اب تو مودودی صاحب فرما رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی اس "فقہی رائے" (فتوے نہیں) کا اظہار حکومت کے ایک اہم افسر سے نجی طور پر کیا تھا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ جماعت کی جانب سے اس بارے میں دھڑا دھڑ لٹریچر تقسیم ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ "نوائے وقت" (جسے جماعتِ اسلامی والے اپنا اخبار سمجھتے ہیں) کے اس وقت کے ایڈیٹر حمید نظامی مرحوم کو ان طنزیہ الفاظ میں اس کی خبر لینی پڑی۔

> مولانا مودودی صاحب نے مسئلہ کشمیر کے متعلق جو "بصیرت افروز" اور "ایمان افروز" بیان جاری کیا ہے اس کی یہ خصوصیت بڑی دلچسپ ہے کہ یہ بیان ایک انٹرویو کی شکل میں ہے مگر یہ انٹرویو کسی خبر رساں ایجنسی مثلاً ایسوسی ایٹڈ پریس، اورینٹ پریس، یونائٹیڈ پریس یا سٹار کے نمائندہ کو نہیں دیا گیا۔ نہ کسی اخبار کے نمائندہ کو بلایا گیا ہے بلکہ "اسلامک نیوز ایجنسی" کے نام سے ایک خانہ ساز ایجنسی کے فرضی نمائندے کو "بلا کر" ایک طویل انٹرویو کی روئیداد مرتب کر لی گئی ہے۔ نمائندہ کو "فرضی" ہم نے اس لئے کہا ہے کہ سوالات وجوابات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اخباری رپوٹر مولانا سے سوال پوچھ نہیں رہا۔ بلکہ یہ بات شروع ہی سے مولانا کے مدنظر ہے کہ یہ جواب دینا مقصود ہے۔ اس لئے سوال بھی اس جواب کے مطابق گھڑ لیا گیا ہے۔ یعنی سوال پوچھنے والے بھی مولانا ہی ہیں اور جواب دینے والے بھی مولانا۔ انٹرویو بھی مولانا سے ہو رہا ہے اور انٹرویو بھی مولانا ہی کر رہے ہیں۔ اخباری نمائندہ بھی مولانا ہی ہیں اور ایڈیٹر بھی مولانا۔
>
> "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ"

(روزنامہ نوائے وقت۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۸ء)

مولانا شبیر احمد عثمانی کا مکتوب

بیان بازی کے بعد مولانا نے اپنے غلط فتوے کو شرعی بنیادیں فراہم کرنے کے لئے اپنے جریدہ رسالہ ترجمان القرآن میں جب بحث کا آغاز کیا تو علمائے اسلام کو اس کا سخت قلق ہوا۔ چنانچہ ان کی غلطی سے آگاہ کرنے کے لئے مولانا شبیر احمد عثمانی نے ایک ذاتی مکتوب مولانا ظفر احمد انصاری کی معرفت انہیں بھجوایا۔ یہ خط وکتابت کافی طویل ہے جو بعد میں کراچی سے شائع ہونے والے جماعت ہی کے ایک رسالے "نشانِ راہ" کی ۴ر ستمبر کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی اور اب اسے "خطباتِ عثمانی" نامی کتاب میں بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تمام مکتوبات کا من وعن نقل کرنا تو ممکن نہیں، لیکن چونکہ ان سے جہادِ کشمیر کی شرعی حیثیت کے بارے میں علمی بحث کی گئی ہے اس لئے ہم مختلف خطوط کے جستہ جستہ اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ حضرت

عثمانی صاحب اپنے پہلے خط کی ابتدا ان الفاظ سے فرماتے ہیں۔

السلام علیکم ۔ بعض احباب نے مجھے ترجمان القرآن کا وہ پرچہ دکھایا جس میں آپ نے کسی شخص کے خط کا جواب دیتے ہوئے جنگِ کشمیر کے متعلق اپنے خیالات شرعی حیثیت سے ظاہر فرمائے ہیں ۔ جنگِ کشمیر کے اس نازک مرحلے پر آپ کے قلم سے یہ تحریر دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور شدید قلق بھی ہوا ۔ کیونکہ میرے نزدیک اس معاملے میں جناب سے ایسی مہلک لغزش ہوئی ہے جس سے مسلمانوں کو عظیم نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

جہاں تک نفسِ مسئلہ کا تعلق ہے آپ کا خیال ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کے حق میں کشمیر کی یہ جنگ اسلامی جہاد کا حکم نہیں رکھتی ۔ کیونکہ حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے اور مملکتِ پاکستان کے باشندے اس معاہدے کا احترام کرنے پر شرعاً مکلف ہیں ۔ اب اگر وہ اس جنگ میں حصہ لیں تو یہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہوگی ۔ کاش اس موقعہ پر آپ محولہ معاہدہ کی متعلقہ دفعات بھی نقل فرما دیتے تو بہت اچھا ہوتا ۔

(خطباتِ عثمانی مرتبہ پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی صفحہ ۲۵۲)

اس کے بعد حضرت عثمانی نے تفصیل سے شرعی دلائل دے کر مودودی صاحب کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کی ۔ ان کے اس مکتوب کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ مودودی صاحب نے بعد میں اپنی یہ دلیل کہ چونکہ مملکت خداداد پاکستان کے حکام فاسق و فاجر ہیں لہٰذا جہاد درست نہیں' دوبارہ نہ دہرائی ۔ (خطباتِ عثمانی صفحہ ۲۴۶) تاہم انہوں نے حضرت عثمانی کے دلائل تسلیم کرنے کی بجائے انہیں ایک لمبا چوڑا خط لکھا جن میں ان وجوہ کو نمبر وار پیش کیا جن کی بنا پر وہ جہادِ کشمیر میں جنگی امداد کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے تھے ۔ ان کی سب سے اہم اور پہلی دلیل ان کے اپنے الفاظ میں یوں ہے ۔

(۱) یہ امر واقعہ ہے کہ پاکستان کی موجودہ حکومت مسلمانانِ پاکستان کے اپنے منتخب کئے ہوئے نمائندوں پر مشتمل ہے اور خصوصاً اس حکومت کے گورنر جنرل کو کم از کم ۹۹ فیصدی مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے ۔ لہٰذا کسی بیرونی قوم کے ساتھ جو معاہدات یہ حکومت طے کرے وہ دراصل ہماری قوم کی طرف سے وکالتاً طے ہوں گے اور ہم سب شرعاً اور اخلاقاً خدا اور خلق کے سامنے انہیں وفا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے ۔ جب تک ان لوگوں کو قوم کی نمائندگی کا منصب حاصل ہے ہمارے افراد کو انفرادی طور پر ان کے کئے ہوئے معاہدات کی ذمہ داری سے بری ہو جانے کا حق نہیں ہے ۔ (ایضاً صفحہ ۲۵۲)

علمائے پاکستان کا فتوےٰ

یہ خط و کتابت جتنی لمبی ہوتی جاتی تھی عامۃ الناس کے شکوک و شبہات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا تو اس صورتِ حالات پر غور کرنے کے لئے پاکستان کے کچھ جید علماء اکٹھے ہوئے جن میں مندرجہ ذیل سربرآوردہ ہستیاں شامل تھیں ۔ (۱) مولانا سید میرک شاہ صاحب اندرابی' صدر جمعیۃ العلمائے انصار المجاہدین لاہور ۔ (۲) مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن

خدام الدین شیرانوالہ گیٹ لاہور۔ (۳) مولانا محمد حسن صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور۔ (۴) مولانا نور الحسن صاحب مہتمم تنظیم اہل سنت لاہور۔ (۵) مولانا سید محمد احمد صاحب خطیب مسجد وزیر خان لاہور۔

ان حضرات نے جہادِ کشمیر کے جواز کے بارے میں جو متفقہ فتوےٰ دیا تھا وہ روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۱۰ اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس کا آخری پیرہ ان الفاظ پر مشتمل تھا۔

کشمیر کی موجودہ جنگ میں آیت مذکورہ کا پورا نقشہ موجود ہے۔ وہاں کے کمزور مسلمان مرد عورتیں اور بچے کفار سے عاجز ہو کر فریاد کر رہے ہیں۔ ان کی رہائی اور اسلام کے اعزاز، فتنہ کفر کے استیصال کے لئے باقاعدہ امارت کے ماتحت ایک باقاعدہ اسلامی فوج جنگ کر رہی ہے۔ لہٰذا اس کے جواز شرعی ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں؟

لیکن پاکستان کے ان سرکردہ علماء کے اس فتوے سے مودودی صاحب کی تسلی نہ ہوئی۔ اور وہ اس بحث کو مزید الجھاتے چلے گئے۔ اور اب مذکورہ انٹرویو میں یہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنی اس فقہی رائے سے ایک سرکاری افسر کو تنہائی میں مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ اس وقت صورت حالات یہ تھی کہ ایک طرف مودودی صاحب تھے جو اپنی غلط "فقہی رائے" پر اڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف سارے پاکستان کے ممتاز علماء انہیں ان کی غلطی پر متنبہ کر رہے تھے۔ اس صورتِ حالات سے تنگ آکر نوائے وقت کے ایڈیٹر جناب حمید نظامی مرحوم نے بڑے دردناک الفاظ میں ایک اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا "کج بحثی پر افسوسناک اصرار" واضح رہے کہ اگرچہ اس وقت قریب قریب تمام اخبارات میں مودودی صاحب کے خلاف لکھا جا رہا تھا لیکن ہم نوائے وقت کے اقتباس اس لئے نقل کر رہے ہیں کہ اب بھی جماعت اسلامی والے اسے اپنا اخبار سمجھتے ہیں اور حمید نظامی مرحوم کو پاکستان کا سب سے بڑا دیانتدار صحافی قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا یہ یادگار اداریہ انکے اخبار نوائے وقت کی ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت سے ملاحظہ فرمائیں۔

مودودی صاحب نے مسئلہ کشمیر کے متعلق اپنے اخبار میں ایک بیان چھپوایا تھا ہم نے اس بیان پر دو دن کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ہمارا یہ ارادہ تھا کہ اب ہم اس موضوع پر کچھ نہ لکھیں اس لئے کہ ہم اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتے تھے۔ مودودی صاحب مصر ہیں کہ پاکستان کے مسلمانوں کو جہادِ کشمیر میں کشمیری مسلمانوں کی امداد نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ کشمیر کی جنگ مولانا کے نزدیک پاکستانیوں کے لئے جہاد نہیں بلکہ اس لڑائی میں پاکستانی مسلمانوں کا لڑنا ازروئے قرآن ناجائز ہے۔ مودودی صاحب علم دین کے لحاظ سے کوئی زیادہ ممتاز شخصیت نہیں۔ آپ ایک اچھے انشا پرداز اور ادیب ہیں۔ مگر دین کے متعلق آپ کا علم کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں اس لئے خیال تھا کہ اگر آپ سے بہتر اور فاضل تر علماء آپ کو سمجھا دیں گے کہ اس مسئلے میں آپ کو غلطی ہوئی ہے تو آپ اس پر اصرار نہیں کریں گے۔ مگر بدقسمتی سے مولانا علم وادب میں منتہی ہونے کے دعوے دار ہی نہیں امارت کے مدعی بھی ہیں اس لئے آپ برابر اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ باقی سب کی رائے غلط ہے اور جو میں کہتا ہوں وہ صحیح ہے۔

قرآن کی رو سے بھی مولانا صاحب کے موقف کو متعدد علماء نے غلط قرار دیا۔ مگر مولانا مصر ہیں کہ رائے میری ہی درست ہے۔ ہم نے مایوس ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مولوی صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ بحث جاری رکھنے کا نتیجہ بھی تھا کہ زیادہ نہ سہی چند لوگ ہی مولانا کے غلط استدلال سے گمراہ ہو کر مجاہدین کی امداد سے دست کش ہو جائیں۔ مگر مولانا نے نہ صرف ایک ایسا بیان جاری کر دیا جو ان کے پرانے ارشادات سے بھی زیادہ خطرناک ہے بلکہ اب یہ بیان کثیر تعداد میں چھپوا کر تقسیم بھی کیا جا رہا ہے اور ائمۃ المسلمین میں مسئلہ کشمیر کے متعلق غلط فہمیاں اور انتشار پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

خدا جانے کیوں، مگر اس مرتبہ قرآن کو چھوڑ کر مولانا صاحب نے اس بیان میں زیادہ تر ہندوستان اور پاکستان کے مابین مختلف اقتصادی، مالی اور تجارتی معاہدوں کا ذکر کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کی مملکتوں کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے ہی ان دونوں کے درمیان معاہدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہ دونوں نئی حکومتیں ایک ہی بٹوارے سکیم کے ماتحت قائم ہوئیں۔

اب فرمائیے! اس عجیب و غریب منطق کا کیا جواب دیا جائے وہ مولانا فرماتے ہیں کہ پاکستان نے ہندوستان میں اپنا ہائی کمشنر بھیج رکھا ہے۔ اس لئے دونوں حکومتوں کے درمیان معاہدہ ہے اور پاکستان کے باشندے اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں کو مدد دینے کے مجاز نہیں۔ مولانا صاحب کے اس بیان میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ کشمیر کے متعلق بھی حکومت پاکستان اور حکومت ہندوستان میں معاہدہ ہو چکا ہے اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ کشمیر کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا۔ خدا جانے یہ سمجھوتہ کب ہوا۔ پاکستان تو پہلے دن سے یہی کہہ رہا ہے کہ ہم کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کو فراڈ سمجھتے ہیں اور اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ مگر مولانا مودودی کی رائے یہ ہے کہ از روئے معاہدہ مہاراجہ کشمیر کو ہندوستان سے الحاق کا حق حاصل تھا۔ اور پاکستان یہ نہیں کہہ سکتا کہ کشمیر کے معاملے میں ہمارا ہندوستان سے سرے سے کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ مولانا کشمیر کے معاملے میں سب جھگڑوں اور مصیبتوں کی ذمہ داری ہمارے لیڈروں کی اہم غلطیوں پر ڈالتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک عبداللہ، ہری سنگھ اور پٹیل تو بے گناہ اور بے قصور ہیں اور سارا قصور جناح، غلام عباس اور ابراہیم کا ہے۔ اور مولانا کے بیان کی تان اس پر آکر ٹوٹتی ہے کہ جب تک پاکستان ہندوستان کے خلاف باقاعدہ جنگ نہ کرے پاکستانی مسلمانوں کو کشمیری مسلمانوں کو مدد دینے کا کوئی حق نہیں۔

اب ان مولانا صاحب کو کون یہ بات بتائے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین واقعی سرے سے کوئی معاہدہ ہی نہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کا مفروضہ ہی غلط ہے۔ محض ہائی کمشنروں

کا تبادلہ پاکستان کے مسلمانوں کے لئے جہادِ کشمیر میں شرکت کو حرام نہیں بنا دیتا۔ سپین اور برطانیہ میں معاہدہ تھا۔ سپین اور اٹلی اور جرمنی کے مابین بھی کئی معاہدے تھے اور سفراء کا بھی باہمی تبادلہ تھا۔ مگر انگریز، جرمنی اور اطالوی رضاکار سپین کی سول نافرمانی میں جا کر لڑتے رہے۔ اب مصر، عراق، سعودی عرب اور شام کے امریکہ سے تجارتی، مالی اور سیاسی معاہدے بھی ہیں اور سفراء اور نمائندوں کا باہمی تبادلہ بھی ہے۔ مگر امریکہ نام نہاد حکومتِ اسرائیل کو مدد دے رہا ہے اور مصر، عراق اور سعودی عرب کی فوجیں حکومتِ اسرائیل کے خلاف برسرِ پیکار ہیں اور امریکی اور برطانوی رضاکار ان عربوں کے خلاف لڑ بھی رہے ہیں حالانکہ امریکہ اور برطانیہ نے ان ملکوں کے خلاف کوئی اعلانِ جنگ نہیں کیا۔ قرآن کی روشنی میں علمائے کرام ثابت کر چکے ہیں کہ مولانا مودودی صاحب کا نظریہ غلط اور گمراہ کن ہے۔ بین الاقوامی قانون اور سیاست کی رُو سے بھی ان کی اختیار کردہ پوزیشن بالکل غلط ہے۔"

(نوائے وقت مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء۔ اداریہ)

ہم قارئین سے اتنے طویل اقتباس کے لئے معذرت خواہ ہیں لیکن اس کا من وعن نقل کرنا اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اس میں جہادِ کشمیر کے بارے میں الجھائی ہوئی بحث کے تمام گوشے آ گئے ہیں۔ اور اس اداریئے کے بعد تو انہوں نے یوں محسوس کیا کہ ان کے ارد گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجلسِ شوریٰ کا اجلاس بلا کر ایک تنکے کا سہارا لے کر جہادِ کشمیر کے جواز کا مذکورہ بالا فتویٰ دے دیا۔

معاہدانہ تعلقات والی دلیل کا علمی تجزیہ

اب ہم ان کے معاہدانہ تعلقات والی دلیل کا علمی تجزیہ کرتے ہیں کہ اس بارے میں وہ کس حد تک حق بجانب تھے۔ حضرت عثمانی کے نام خط میں ہم ان کی اس دلیل کو نقل کر آئے ہیں۔ اب اس کے تجزیئے کے لئے اسے دوبارہ نقل کیا جاتا ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ پاکستان کی موجودہ حکومت مسلمانانِ پاکستان کے اپنے منتخب کئے ہوئے نمائندوں پر مشتمل ہے اور خصوصاً اس حکومت کے گورنر جنرل کو کم از کم ۹۹ فیصدی مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔ لہٰذا کسی بیرونی قوم کے ساتھ جو معاہدات یہ حکومت طے کرے وہ دراصل ہماری قوم کی طرف سے وکالتاً طے ہوں گے۔ اور ہم سب شرعاً و اخلاقاً خدا و خلق کے سامنے انہیں وفا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ جب تک ان لوگوں کو قوم کی نمائندگی کا منصب حاصل ہے۔ ہمارے افراد کو انفرادی طور پر ان کے کئے ہوئے معاہدات کی ذمہ داری سے بری ہو جانے کا حق نہیں ہے۔

(خطباتِ عثمانی۔ صفحہ ۲۵۲)

مولانا کی اس دلیل کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ انہوں نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں اسے بطورِ ایک شرعی اصول کے پیش کیا۔ چنانچہ اپنی اس تفسیر کی جلد سوم کے صفحہ ۱۶۲ پر فرماتے ہیں۔

> اگر ظلم کرنے والی قوم سے دارالاسلام کے معاہدانہ تعلقات ہوں تو اس صورت میں مظلوم مسلمانوں کی کوئی ایسی مدد نہیں کی جا سکے گی جو ان تعلقات کی اخلاقی ذمہ داریوں کے خلاف پڑتی ہو۔[1]

مودودی صاحب کے اس انٹرویو کے ذریعے پاکستان کی سیاسی تاریخ کا اہم باب مرتب کرنے والے اگر مودودی صاحب کی مذکورہ بالا دو سطروں پر غور فرماتے تو جہادِ کشمیر کی حرمت کے فتوے کی پوری تفصیلات ان کے سامنے آ جاتیں۔ تاہم اگر ان کی یہ تفسیر صرف انہی دو سطروں تک محدود رہتی تو اس کا تعلق زیادہ سے زیادہ جہادِ کشمیر تک ہی رہتا لیکن انہوں نے جو تفسیر کو ذرا طول دیا تو ایک اور اہم مسئلہ بھی اس کی لپیٹ میں آگیا اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے شادی بیاہ کی حرمت کا فتویٰ تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں یہ بھی فرماتے ہیں۔

> علاوہ بریں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی رُو سے دولتِ اسلامیہ کی ذمہ داری ان مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر رہتے ہیں۔ باہر کے مسلمانوں کے لئے کسی ذمہ داری کا بار اس کے سر نہیں ہے۔ (ایضاً ص۱۳۱)

ہندوستان کے مسلمانوں سے شادی بیاہ حرام

اور پھر ان کی اس تفسیر کا منطقی نتیجہ بھی انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

> پس یہ آیت دستوری و سیاسی ولایت کو ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج قرار دیتی ہے اس عدمِ ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ اس عدمِ ولایت کی بنا پر دارالکفر اور دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے، ایک دوسرے کے قانونی ولی نہیں بن سکتے، باہم شادی بیاہ نہیں کر سکتے اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے ہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دارالکفر سے شہریت کا تعلق نہ توڑا ہو۔ (ایضاً)

پاکستان دارِ عدو ہے

اب تو راقم کو مودودی صاحب کی ان فقہی آرا اور تفاسیر کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔ لیکن جب وہ جماعتِ اسلامی کا ادنیٰ سا خادم تھا تو جو صاحب بھی مودودی صاحب کے جہادِ کشمیر کی حرمت کے فتوے کا ذکر کرتے ان کے سامنے مودودی صاحب کے یہ دلائل بڑے فخر سے پیش کرتا۔ اپنے شہر کے مشہور عالمِ دین میاں اصغر علی صاحب جن کے ہاں جماعتِ اسلامی کے تمام چھوٹے بڑے لیڈر بطور مہمان ٹھہرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار مجھے کہا کہ مودودی صاحب کی اس دلیل کی کوئی حیثیت تب ہوتی جب وہ پاکستان کو دارالاسلام تو کجا صرف مسلمانوں ہی کی ریاست تسلیم کر لیتے لیکن وہ تو اسے دارِ عدو یعنی دشمن کا گھر سمجھتے ہیں۔ امیر جماعتِ اسلامی ضلع میانوالی مولوی علی محمد صاحب

---

[1] ہم مودودی صاحب کے ان باطل دعاوی کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں، کسی دوسرے وقت لیں گے۔ (طلوعِ اسلام)

جو اُس وقت تک جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہوئے تھے، نے بھی اس کی تائید کی۔ لیکن اس کے باوجود راقم کی آنکھوں سے عقیدت کا پردہ نہ اُٹھا۔ اگلے دن ترجمان القرآن کا تازہ شمارہ موصول ہوا تو اس میں جماعت اسلامی کا یہ مسلک من وعن خود مودودی صاحب کے الفاظ میں درج تھا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

> جس تاریخ کو اس نو زائیدہ مملکت کی آئینی زبان سے یہ شہادت ادا ہوئی۔ اسی روز جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے اس کے ایک اسلامی مملکت ہونے کو تسلیم کر لیا اور ٹھیک ۲ روز بعد پوری آئینی پوزیشن کا جائزہ لے کر یہ اعلان کیا کہ اب اس ریاست کی شرعی حیثیت سابق غیر مسلم ریاست سے بالکل مختلف ہو چکی ہے۔ اب اس کی ملازمت جائز ہے۔ اس کی عدالتوں میں جانا حلال ہے۔ اب ایک باقاعدہ اسلامی مملکت بن جانے کے بعد یہ دار عدو دشمن کا گھر نہیں رہی جس کے خلاف جدوجہد کرنا ہمارا کام ہو بلکہ ہمارا اپنا دار بن گئی ہو۔ جسے سنوارنا اور ترقی دینا ہمارا کام ہو گیا ہے۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۵۱ء
> صفحہ ۶۸ ، ۵/۶۹)

چنانچہ خود مودودی صاحب کی زبانی اس وضاحت کے آجانے کے بعد میاں صاحب نے بتایا کہ اب اس کی روشنی میں جہاد کشمیر کو ناجائز ٹھہرانے والی ان کی معاہدانہ تعلقات والی دلیل پر دوبارہ نظر ڈالیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی اس دلیل کو خود تسلیم نہیں کرتے تھے۔ محض اپنے ایک غلط فتویٰ کو جھوٹا سہارا دینے کے لئے اس کا دامن تھاما اور پھر فرمایا کہ کاش مودودی صاحب اپنے غلط فتوے سے فوری طور پر رجوع فرما لیتے تو اس سے ان کے وقار میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا۔

پاکستانی حکمرانوں پر مودودی صاحب کی کردارکشی کا الزام

یہ ہیں مختصر الفاظ میں جہاد کشمیر کے فتوے کے بارے میں تفصیلات جن کے متعلق مودودی صاحب نے شاید یہ گمان فرما لیا تھا کہ چونکہ ہمارے عوام کا حافظہ ضرب المثل طور پر کمزور ہے اس لئے وہ ان سب پر بڑی ہوشیاری سے دبیز پردہ ڈال کر پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم باب اپنی خواہشات کے مطابق مرتب کروالیں گے۔ یہی نہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو معصوم ثابت کرنے کے لئے اُلٹا اُس وقت کے پاکستانی حکمرانوں پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے جہادِ کشمیر کی حرمت کے فتوے کا جھوٹا افسانہ میری کردارکشی کے لئے گھڑا کیا تھا۔ مودودی صاحب کے اس الزام میں اگر ذرہ بھر بھی صداقت ہو تو اُس وقت کے پاکستانی حکمران جن میں خان لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان بھی شامل ہیں، واقعی مجرم قرار پاتے ہیں۔ لیکن اگر اصل حقیقت تلاش کی جائے تو اپنے الزام کے برعکس خود مودودی صاحب اس کے مرتکب نظر آتے ہیں۔ اُس وقت کے پاکستانی حکمرانوں کے بارے میں آپ جو کچھ فرماتے رہے ہیں قلم انہیں مشہود کرنے سے عاجز ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود بانی پاکستان قائداعظمؒ تک کو نہ بخشا۔ ان کی مشہور کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوم میں ان کے مندرجہ ذیل ارشادات تو کلاسک حیثیت اختیار کر چکے ہیں:-

افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے پرکھتا ہو"

اور یہ بھی کہ:۔

جن کے خیالات، نظریات اور طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔

جون ۱۹۴۵ء کے ترجمان القرآن میں حصول پاکستان کی پوری تحریک پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

یہ بحث اُن سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

چوروں کو موقع پر پکڑ لیا جائے تو کبھی کبھی ان کا منہ کالا کر کے پھرایا جاتا ہے۔ ان کے اس سنگین جرم کے باوجود سنجیدہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ "غیر شریفانہ حرکت ہے۔" لیکن ملاحظہ فرمائیں کہ مودودی صاحب کن ہستیوں کے ساتھ یہ "غیر شریفانہ حرکت" کر رہے ہیں؟ کیا کردارکشی کی اس سے بھیانک صورت کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟

تاہم انہوں نے اسی پر ہی بس نہیں کیا۔ قائد اعظم اور مسلم لیگ کے دیگر زعما کو ہدف طعن و تشنیع بنانے کے بعد لکھا کہ:۔

یہ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی ہے۔ جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

تحریک پاکستان کے لیڈروں کی کردارکشی کی اس سے زیادہ خطرناک صورت کیا ہو سکتی ہے! تاہم اس حقیقت کے مدنظر کہ ہارنے والے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے اکثر و بیشتر ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ ان کی یہ نازیبا حرکت کسی حد تک گوارا کی جا سکتی تھی۔ لیکن مودودی صاحب تو اس سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ تفسیر قرآن جیسی متبرک کتاب میں ان لیڈروں کو ایسی ایسی مغلظات سے نوازتے ہیں کہ ایک شریف آدمی عام حالات میں بھی انہیں زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ مثلاً کبھی تو ان کو شیطان کے شاگردوں کا لقب دیا جاتا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۹۹)۔ ان کی حکومت کو فرعونی قرار دیا جاتا ہے (ایضاً۔ جلد سوم۔ صفحہ ۶۳۷) یہاں تک کہ انہیں بے ایمان، شیطان، ظالم، جھوٹے اور بے حیا کی مغلظ گالیاں دینے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ (ایضاً۔ جلد دوم صفحہ ۳۹۹، ۴۰۰)

کیا ہم مودودی صاحب سے پوچھنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ وہ جن پاکستانی حکمرانوں پر اپنی کردارکشی کا الزام لگا رہے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی انہیں "ایسے شاندار" الفاظ سے یاد کیا ہے جن سے آپ انہیں نواز رہے ہیں۔ اگر کیا ہے تو کسی ایک گالی کی نشاندہی فرما دیں۔ ورنہ قارئین اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ آپ اپنی جس کردارکشی کا الزام پاکستانی حکمرانوں پر لگا رہے ہیں، دراصل

اُن کی کردار کشی کر کے آپ نے اس کا ارتکاب خود فرمایا ہے۔

آخر میں راقم، مدیر "پیمان" سے کراچی سے بھی درخواست کرے گا کہ اگر وہ مودودی صاحب کے انٹرویو کے ذریعے پاکستان کی سیاسی تاریخ کا کوئی اہم باب ترتیب دینا چاہتے ہیں تو ہماری ان گزارشات کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دیں۔ تاکہ تاریخی ریکارڈ میں کمی نہ رہ جائے۔

مفکرِ قرآن کے انقلاب آفریں تازہ خطابات کے

پمفلٹ

ہر پمفلٹ ۷۵/- پیسے علاوہ محصول ڈاک

(۱) **کیا ہم آزاد ہیں؟** نظامِ جمہوریت کا تجزیہ قرآنی روشنی میں۔

(۲) **غلامی سے بدتر ہے بے یقینی** ہماری پریشانیوں کا بنیادی سبب

(۳) **اعمال نامہ** وہ غلطیاں جن کی سزا ہم اس وقت بھگت رہے ہیں۔

(۴) **جبر ہے دلِ نے اختیار کیا تھا** جمہوری حکومت اور اسلامی نظام میں فرق۔ حدود اللہ کا قرآنی مفہوم۔ اسلامی مملکت قائم کرنیوالوں کا ذاتی کردار

ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/ بی گلبرگ ۲ - لاہور

ضرورتِ رشتہ

ایک قرآنی فکر کے حامل، شریف متوسط خاندان کے خوش شکل اور نیک سیرت نوجوان کے لئے جو ڈبل ایم - اے ہے اور ایل - ایل - بی کا امتحان دینے والا ہے، نیز معقول تنخواہ پر ملازم بھی ہے ایک متوسط خاندان کی ایف - اے یا بی - اے پاس لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔

(خط و کتابت بصیغۂ راز۔) ص - م - ا - معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/ بی گلبرگ ۲ لاہور

برخورداران قوم

لاہور۔ آج دوپہر چوک ریلوے اسٹیشن میں لاہور اومنی بس کے ڈپو کی دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے پھل فروشوں اور پولی ٹیکنیک کے طلبا میں تصادم کے دوران نو افراد سخت زخمی ہو گئے۔ اس دوران پھل کی تقریباً بیس دکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا....... زخمیوں میں سات طلبا اور تین پھل فروش شامل ہیں...... لوٹ مار اور آتش زنی کے دوران ایک دکاندار کی ۱½ سو گھڑیاں بھی غائب ہو گئیں۔ فریقین نے ایک دوسرے پر آزادانہ خشت باری کی اور چھریوں کے علاوہ آہنی سریئے استعمال کئے۔ (نوائے وقت - ۱۸ر جنوری)

(۰)

پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر مسٹر فرید پراچہ نے کہا ہے کہ حکومت یونیورسٹی کے امور میں کھلم کھلا مداخلت اور طلبا کے خلاف مزاحمت کی پالیسی ترک کر دے۔ بصورت دیگر اسے طلبہ کے شدید ترین ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مسٹر پراچہ نے یہ اعلان آج یہاں ایک پریس کانفرنس میں کیا۔

(نوائے وقت - ۱۸ر جنوری)

(۰)

مقامی پولیس نے آج گرفتار شدہ آٹھ طلبا کو مجسٹریٹ درجہ اول دستگیر مرزا کے روبرو پیش کر کے ان کا سات روزہ ریمانڈ حاصل کر لیا ہے....... ان طلبا کو گزشتہ روز صدرِ مملکت کے باڈی گارڈ سے سٹین گن چھیننے کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ (نوائے وقت - ۲۰ر جنوری)

(۰)

پشاور۔ آج پشاور میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس والوں کے ساتھ ایک تصادم میں نوشہرہ کالج کے طلبہ نے مشتعل ہو کر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی دو بسوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ یہ طلبا پشاور یونیورسٹی کے ہڑتالی طلبہ کی حمایت کے لئے پشاور گئے تھے...... تصادم کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بعض طلبہ کو جی۔ ٹی۔ ایس کی بسوں میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے سوار نہ کیا گیا اور وہ مشتعل ہو گئے۔

(نوائے وقت - ۲۰ر جنوری)

(۰)

کراچی۔ گورنمنٹ گرلز کالج ناظم آباد کی ایک طالبہ کے ایک بس تلے آ کر جاں بحق ہو جانے پر مشتعل طلبا کے ایک ہجوم نے دو پرائیویٹ بسوں کو آگ لگا دی۔ (نوائے وقت - ۲۵ر جنوری)

(۰)

راولپنڈی۔ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے طلبا نے آج صبح کئی بسوں کو انسٹی ٹیوٹ کے سامنے روک لیا وہ پرائیویٹ بسوں کی طرف سے کرائے زیادہ وصول کرنے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ طلبہ نے شکایت کی کہ پرائیویٹ بسوں والے طلبا کو حکومت کی طرف سے مقرر کردہ رعایت نہیں دے رہے۔ طلبا کے ایک بڑے ہجوم نے کم ازکم ۱۲ بسوں پر قبضہ کر لیا اور کالج کے احاطہ میں لے گئے جس سے دیگر بسوں کے ڈرائیوروں نے یہ راستہ چھوڑ دیا اور دوسرے راستوں سے بسیں لے جاتے رہے۔ بعدازاں پولیس کی یقین دہانی پر کہ اُن سے زائد کرایہ وصول نہیں کیا جائے گا، طلبا منتشر ہو گئے۔ (نوائے وقت ۲۷ جنوری)

(۰)

نواب شاہ۔ اسسٹنٹ کمشنر نواب شاہ نے طلبا اور شہریوں سے اپیل کی ہے کہ وہ پُرامن رہیں۔ ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے۔ بعض سکولوں کے طلبا نے ہڑتال کر رکھی ہے۔ ہڑتالی طلبا نے آج دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جلوس نکالا۔ اور نعرے لگاتے ہوئے گورنمنٹ کالج پہنچے اور طلبا کو ہوسٹل بند کر دینے کو کہا۔ اس کے علاوہ انہوں نے لیاقت مارکیٹ کے دکانداروں کو دکانیں بند کرنے پر بھی مجبور کیا۔ ہوسٹل کے کمروں میں توڑ پھوڑ شروع کر دی اور فرنیچر کو نقصان پہنچایا۔ کمروں کے دروازے اور کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیئے۔ کئی کپڑے بھی جلا دیئے۔ چند اشیا لوٹ لی گئیں۔ اسسٹنٹ کمشنر موقعہ پر پہنچ گئے اور پولیس کو طلب کر لیا جس پر طالب علم بھاگ گئے۔

اس کے بعد طلبا کا ایک اور گروہ موقعہ پر پہنچ گیا جو جئے سندھ کے نعرے لگا رہا تھا۔ انہوں نے دکان کے باہر پڑے ہوئے سامان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہوئے جس پر پولیس نے ان کا تعاقب کیا۔ بعض افراد کے خلاف مقدمات درج کر لئے گئے۔ لیکن ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ اسسٹنٹ کمشنر نے آج ہیڈ ماسٹروں اور معززین شہر کا اجلاس بلایا اور طلبا اور شہریوں سے اپیل کی کہ وہ ہنگاموں سے باز رہیں۔ اور فضا کو پُرامن رکھیں۔ (نوائے وقت ۲۷ جنوری)

(۰)

لائل پور۔ زرعی یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر حافظ وصی محمد خان نے آج ۹½ بجے صبح طلبا کی معیت میں، وائس چانسلر کے دفتر پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے بعدازاں ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں بتایا کہ ہمارا ایمان ہے کہ تخریب کاری اور انتشار کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم نے حکومت کے احساس کو بیدار کرنے کے لئے یہ اقدام کیا ہے۔ ...... (نوائے وقت۔ ۲۷ جنوری۔)

(۰)

کراچی میں ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات

حاصل کرنے کے لئے

دفتر بزم طلوع اسلام کراچی سے رابطہ قائم کریں ←　ٹیلیفون نمبر ۴۱۰۶۸

پتہ:- ۱۱/۱۳ فردوس مارکیٹ۔ (بالمقابل سعید منزل بٹلی چورنگی) ناظم آباد۔

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان

سٹینڈرڈ آٹوموبائلز

پر تشریف لائیے!

سپیشلسٹ - ڈاج - بیڈفورڈ - لی لینڈ - بی - ایل - ایم - سی - ڈیلرز - موٹر پارٹس - ٹرک ڈیزل پارٹس

۱۳۵ - بادامی باغ - ٹیلیفون - (۶۹۰۱۲) - لاہور

محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار - صبح ۹½ بجے

بمقام

۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

ٹیلیفون (۸۰۰۸۰)

لائل پور میں

(بذریعہ ٹیپ)

بروز جمعہ - ۳½ بجے بعد نماز جمعہ

بمقام - دفتر بزم طلوع اسلام

راجہ چوک - ریل بازار - لائلپور

رابطہ کے لئے - ٹیلیفون (۲۴۹۴۷)

ملتان میں

(بذریعہ ٹیپ)

بعد نماز جمعہ

بمقام - دفتر شاہ سنز

بیرون پاک گیٹ - ملتان

ٹیلیفون - ۲۰۷۱

سیالکوٹ میں

(بذریعہ ٹیپ)

ہر اتوار - صبح ۹½ بجے

بمقام - چوہدری محمد دین ٹی سٹال

کرسچین ٹاؤن - سیالکوٹ ۲

کراچی میں

ہر اتوار - صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ)

بمقام: - دفتر بزم طلوع اسلام - ۱/۳ فردوس مارکیٹ

(بالمقابل بس سٹاپ) پہلی چورنگی - ناظم آباد - کراچی ۱۸

ٹیلیفون ۶۱۰۴۶۸

کوئٹہ میں

(بذریعہ ٹیپ)

ہر اتوار - ۳½ بجے بعد دوپہر

بمقام - ۳ گوردت سنگھ روڈ

کوئٹہ - فون ۷۰۲۰

راولپنڈی میں

(بذریعہ ٹیپ)

ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر

بمقام - جی ۱۲۶ - لیاقت روڈ

راولپنڈی

واہ میں

(بذریعہ ٹیپ)

ہر جمعہ - بعد نماز جمعہ

بمقام - ۱۵ - جہلم روڈ

واہ (WAH)